پاکستان میں سب سے زیادہ پسند کیے جانے والے ناول عشق کا عین کے مصنف علیم الحق حقی کے قلم سے
دو نئے ناول ایک جلد میں
کٹھ پتلیاں
زخم نہاں
علیم الحق حقی

ایک جلد میں دو ناول

ترتیب

پیش لفظ

ایک جلد میں دو ناول 'کٹھ پتلیاں' اور 'زخمِ نہاں' پیشِ خدمت ہیں۔ ان کے بارے میں فیصلہ تو آپ ہی کو کرنا ہے۔ میں کیا عرض کرسکتا ہوں' سوائے اس کے کہ 'کٹھ پتلیاں' میری پسندیدہ ترین کہانیوں میں سے ایک ہے۔ ویسے مجھے امید ہے کہ انسانی نفسیات میں دلچسپی رکھنے والے اورعلمِ نفسیات کے طلبا' میرے قارئین کو یہ دونوں کہانیاں خصوصیت سے بہت زیادہ پسند آئیں گی۔

میں ان تمام خواتین و حضرات کا شکرگزار ہوں' جنہوں نے مجھے ایک ہزار روپے کے منی آرڈر بھیج کر میرے ہاتھ مضبوط کیے۔ یہ کتاب اور آئندہ شائع ہونے والی ہر کتاب بازار میں پہنچنے سے پہلے ان کے ہاتھوں میں ہوگی۔ اور اب انشااللہ آپ کو ہر ماہ ایک کتاب باقاعدگی سے ملتی رہے گی۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے اور میں اُس کا شکرادا کرتا ہوں۔

میرے بچوں کو بھی مطالعے کا بہت شوق ہے۔ وہ اتنا پڑھنا چاہتے ہیں کہ یہاں بچوں کے لئے اُتنی کتابیں بھی شائع نہیں ہوتیں۔ میرا بہت جی چاہتا تھا کہ بچوں کے لئے بہت کچھ لکھوں۔ لیکن وقت نہیں نکال پاتا۔ اب اس کمی کو اور طرح سے دُور کرنے کی کوشش کی ہے۔ محترمہ شگفتہ ناہید عالمی ادب کی مایہ ناز طویل داستان 'الف لیلیٰ' کو بچوں کی ضرورت کے مطابق تحریر کر رہی ہیں۔ ہم انشااللہ اس کے دو حصے ہر ماہ شائع کریں گے۔ امید ہے کہ یہ داستان پچاس سے

زائد حصوں پر محیط ہوگی۔ امید ہے کہ آپ کی حوصلہ افزائی شاملِ حال رہے گی۔
السادات بک کلب کے پرانے ممبروں سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں الگ سے تحریر فرمائیں کہ یہ الف لیلیٰ بھی انہیں منگوانی ہے۔ جو نئے لوگ ممبرشپ کے لیے اک ہزار روپے بھیجیں، وہ ساتھ میں اس کے متعلق بھی بتائیں کہ انہیں 'الف لیلیٰ' بھیجی جائے یا نہیں۔

میں نہ صرف اس کتاب پر آپ کے تبصرے، بلکہ آپ کے مشوروں اور تجاویز کا بھی منتظر ہوں۔ آپ سب کی محبتیں اور دعائیں میرا زادِ راہ اور میرے لیے باعثِ افتخار ہیں۔ میں آپ کے خطوط کا منتظر ہوں۔

والسلام

علیم الحق حقی
B-203، الآمنہ ایونیو
سیکٹر 7D-1، نارتھ کراچی
فیکس: (92-21) 7736353
ای میل: z-associates@cyber.net.pk

میلے کی رونقیں رات کے ساتھ دم توڑ رہی تھیں۔ ہجوم چھٹ چکا تھا۔ وہ پورے چاند کی رات تھی اور سمندر بُری طرح بپھرا ہوا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی خود کو سمندر کے سپرد کرنے کی نیّت سے ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ دُبلی پتلی اور عجیب سی لڑکی تھی۔ اس کے جسم پر گوشت بالکل نہیں تھا، گویا ہڈیوں پر کھال مندھی ہوئی تھی۔ استخوانی چہرے کے نقوش گواہی دیتے تھے کہ وہ چہرہ کبھی پُرکشش رہا ہوگا۔۔۔ لیکن اب بھوک، عسرت اور پریشانی نے اسے مسخ کر دیا تھا۔ اس تباہ حالی کے باوجود اس کی بڑی بڑی نیلی آنکھیں بے حد خوب صورت تھیں، وہ آنکھیں اس عالم میں بھی کسی بھی شخص کو مسحور کر لینے کی اہلیت رکھتی تھیں۔ ان میں بلا کی چمک تھی، انہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ جھیل کے آئینے میں ستاروں کے رقص کا منظر دیکھ رہے ہوں۔ وہ نیلی آنکھیں اس کی خوب صورت خانہ بدوش ماں کا تحفہ تھیں۔

لڑکی کا نام تانیا تھا، وہ اس دنیا میں بالکل اکیلی تھی۔ اس کی ماں ایک خانہ بدوش قبیلے سے تعلق رکھتی تھی، بائیس سال کی عمر میں وہ ایک شہری بابو کی محبت میں گرفتار ہوگئی اور اس نے اس محبت کے لیے خود کو تج دیا۔ نگر نگر گھومنے والے پنچھی نے پنجرہ قبول کر لیا۔۔۔ کیوں کہ اس پنجرے کی تیلیاں محبت کی دھات سے بنی تھیں۔ شہری بابو کی محبت نے ہواؤں کی طرح آزاد اس بُلبُل کو سدھا لیا۔ اس نے رانی کو عزت کے مفہوم اور اس کی اہمیت سے آگاہ کرایا۔ رانی بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی لیکن بنجاروں والی فطرت اس کی محبت اور وفا کے لیے بہت بڑا امتحان

بھی تھی۔ کبھی کبھی گھر کی چار دیواری میں اس کا دم گھٹنے لگتا۔ وہ کھلے میدانوں، وادیوں اور پربتوں پر قلانچیں بھرنے والی ہرنی تھی‘ رقص و نغمہ کی محبت اس کے لہو میں شامل تھی۔ وہ بے چین ہو ہو جاتی‘ لیکن اس کے پیروں میں محبت کی زنجیریں تھیں۔ پھر اس نے یہ نکتہ پالیا کہ زنجیر اور پایل میں کتنا ہی فرق ہو‘ جھنکار دونوں کی یکساں ہوتی ہے۔ جب بھی گھٹن حد سے گزرتی‘ وہ ناچتی۔ اتنا ناچتی کہ تھک کر گرے بغیر نہ رہتی۔ وہ بنجاروں کے گیت گاتی‘ یہاں تک کہ اس کی بے چین روح آزادی سے سرشار ہو جاتی۔ ننھی تانیا حیرت سے اسے دیکھتی اور کبھی کبھی اس کی تقلید میں خود بھی ٹھمکنے لگتی۔ ایسے میں رانی اُسے بڑے پیار سے سمجھاتی کہ اس کا باپ ناراض ہوگا‘ اور یہ کہ عزت دار لوگوں کی بیٹیاں نہیں ناچتیں‘ باپ کی ناراضی ننھی تانیا کو گوارا نہیں تھی۔ اتنی محبت کرنے والے باپ کو بھلا کون ناراض کرسکتا تھا۔

تانیا کے باپ نے رانی کو تعلیم کی اہمیت سمجھائی اور تانیا کو اسکول میں داخل کرا دیا۔ وہ تانیا کی مثالی تربیت کرنا چاہتا تھا۔ تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم اور گھر داری کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ جلد ہی تانیا اپنی ماں کے برعکس سینے پرونے میں طاق ہوگئی۔ وہ شروع ہی سے کم سخن اور سیدھی سادی لڑکی تھی۔ ماں باپ کی محبت کی صورت میں اسے دنیا کی ہر نعمت حاصل تھی۔

اس کے باپ کا انتقال ہوا تو وہ صرف سات سال کی تھی۔ اس نے اپنے باپ کی محبت اور شفقت سے محرومی کے ساتھ اپنی ماں کو اجڑتے دیکھا تو سہم کر رہ گئی۔ ماں گھنٹوں بیٹھی خلا میں گھورتی رہتی‘ اسے کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ بس اسے ایک ہی بات یاد رہتی تھی۔ صبح سویرے وہ تانیا سے کہتی کہ اسکول جاؤ بے حد اصرار سے‘ محبت سے اسے تیار کرا کے اسکول بھیجتی۔ اب شاید اس کی زندگی کا مقصد صرف اپنے شوہر کے مشن کی تکمیل تھا۔ تانیا اس وقت تک گزر بسر کے مفہوم سے ناآشنا تھی اور نہ ہی زیور بکنے کا مفہوم سمجھتی تھی‘ وہ صرف باپ کی محبت سے محرومی

کے فرق کو سمجھتی تھی۔ اس کے نزدیک باقی سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ وہ یہ بھی نہ دیکھ سکی کہ جیسے جیسے ماں کے بدن سے زیورات اُترتے جارہے ہیں‘ اس کے چہرے اور پیشانی کی لکیروں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ اس نے ماں کو دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر کشمکش کا تاثر تھا۔ پھر جیسے گھٹن حد سے بڑھ گئی۔ اُس روز وہ عرصے کے بعد ناچی۔۔۔۔ ناچتی رہی اور روتی رہی۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگ گئے۔ وہ تھک کر گری۔۔۔ اور ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔ سہمی ہوئی تانیا نے پہلی بار ماں کے رقص میں دیوانگی محسوس کی تھی‘ اسے وہ رقص موت کا رقص لگا تھا۔۔۔۔ اس پر ماں کا رونا وہ ماں سے لپٹ کر پوچھتی رہی کہ کیا بات ہے؟

’’تو فکر نہ کر تانی۔۔۔ تو اسکول ضرور جائے گی۔‘‘ ماں نے سر اٹھائے بغیر کہا لیکن تانیا کچھ نہ سمجھ سکی۔

اس روز کے بعد یہ معمول ہوگیا کہ شام کے وقت رانی خود کو سفید چادر میں لپیٹ کر‘ تانیا کو دروازہ اندر سے بند کرنے کی ہدایت کر کے گھر سے چلی جاتی۔۔۔ اور اتنی دیر سے آتی کہ تانیا کو سوتے سے اُٹھ کر دروازہ کھولنا پڑتا۔ ماں بہت تھکی ہوئی ہوتی اور بستر پر گرتے ہی بے سُدھ ہو جاتی۔ تانیا نے کئی بار پوچھا کہ وہ کہاں جاتی ہے‘ لیکن وہ ٹال گئی۔

ماں کہیں بھی جاتی ہو‘ تانیا کو یہ پتا چل گیا تھا کہ اس سے بہت فرق پڑ گیا ہے۔ محلے کے لوگ اب انہیں عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ تانیا ان نظروں کا مفہوم تو نہیں سمجھتی تھی لیکن اسے وہ نظریں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ دوسرا فرق یہ تھا کہ اب اُسے صرف ایک بار کھانا ملتا تھا۔۔۔ ماں کے واپس آنے پر۔ ماں اپنے ساتھ کھانا لے کر آتی تھی۔ وہ دونوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتیں۔ لیکن ماں اتنی تھکی ہوئی اور نیند میں ہوتی کہ اس سے ٹھیک طرح کھانا بھی نہیں کھایا جاتا تھا۔ ایک دن

کھانے کے بعد اس نے تانیا کو بہت غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''میری تانیا کتنی کمزور ہوگئی ہے۔'' اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

''ہڈیاں نکل آئی ہیں۔ یہ تو تیرے کھلنے کے دن ہیں میری تانی۔۔۔لیکن عزت سے ایک ہی وقت کی روٹی ملتی ہے میری بچی۔۔۔اور وہ بھی بڑی مشکل سے۔ مجھے معاف کر دینا تانی۔''

تانیا کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔لیکن اس رات ماں کے سونے کے بعد وہ دیر تک ماں کو دیکھتی رہی۔ ماں بہت بدل چکی تھی۔ بھرے بھرے رخسار پچک گئے تھے۔آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے تھے۔۔۔اور جسم میں سوائے ہڈیوں کے کچھ نہیں رہا تھا۔ ایک نامعلوم احساس سے تانیا کی آنکھیں جلنے لگیں ماں کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ عزت سے ایک ہی وقت کی روٹی ملتی ہے میری بچی۔۔۔اور وہ بھی بڑی مشکل سے؟ وہ سب کچھ تو نہ سمجھ سکی۔۔۔لیکن کچھ کچھ سمجھ گئی۔

تانیا نے ماں سے اس کی رات کی مصروفیت کے بارے میں بارہا پوچھا لیکن ماں نے اس کے سوا کبھی کچھ نہیں بتایا کہ وہ کام پر جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ تانیا کے ذہن میں ناخوشگوار خیالات ابھرنے لگے۔ ایک دن اس نے ماں کا پیچھا کیا تو بھید کھلا' نمائش کے پاس ایک سرکس لگا ہوا تھا۔ وہاں موت کا کنواں بھی تھا۔موٹر سائیکل کے شو سے پہلے دو لڑکیاں اسٹیج پر آئیں۔ ان کے پیروں میں گھنگرو بندھے ہوئے تھے۔ پھر اس کی ماں نمودار ہوئی۔ اس نے گانا سنایا۔ سازندے بھی موجود تھے۔ دونوں لڑکیاں رقص کرتی رہیں۔ پھر رانی کی نظر تماشائیوں میں کھڑی ہوئی تانیا پر پڑی۔۔۔اور تانیا نے اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔لیکن وہ بدستور گاتی رہی۔

گانا ختم کر کے وہ تانیا کی طرف آئی۔ ''تم یہاں کیوں آئی ہو؟'' زندگی

میں پہلی بار اس نے تانیا سے سخت لہجے میں بات کی۔

تانیا کی آنکھیں جلنے لگیں۔ ''یونہی مما۔۔۔۔ بس یونہی۔۔۔۔'' وہ ہکلائی۔

''اب تمہیں تسلی ہوگئی ہوگی۔'' رانی کا لہجہ اب بھی سخت تھا۔

''مما۔۔۔آپ یہ سب کیوں کرتی ہیں؟''

''ایک وقت کی روٹی کے لیے میری بچی۔'' رانی کے لہجے میں یکبار اس شفقت امنڈ آئی۔ ''میں پیروں میں گھنگرو بھی باندھ سکتی تھی۔ اس صورت میں ہم خوشحال ہوتے۔ تو گلاب کے پھول کی طرح کھلی ہوئی ہوتی۔ میں اور بڑا سمجھوتا کرتی تو تیرے مستقبل کے لیے بھی بہت کچھ ہو جاتا۔لیکن میں نے صرف ایک وقت کی روٹی اور تیری تعلیم کے لیے چھوٹا سا سمجھوتا کیا ہے تانی۔ میں تیرے باپ کی عزت ہوں اور خود کو اس سے زیادہ نہیں گرا سکتی۔ ہم خانہ بدوش لوگ جب بکتے ہیں تو لاکھ کے عوض بکیں یا ایک نظر کے' سودے کا احترام مرتے دم تک کرتے ہیں۔ گھر واپس جا میری بچی اور آئندہ کبھی یہاں نہ آنا۔ تو بھی تو اپنے باپ کی عزت ہے۔۔۔ہے نا تانی۔''

تانیا کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آنسوؤں نے اس کی بینائی کو دھندلا دیا تھا۔ اُس پر آگہی کا پہلا دروازہ کھلا تھا۔۔۔اور آگہی میں بڑی اذیت ہوتی ہے۔ وہ گھر پہنچ کر خوب روئی۔ اس نے اپنے باپ کو یاد کیا۔ اسے اپنی ماں پر پیار آتا رہا۔ عزت۔۔۔ پیٹ۔۔۔ سمجھوتے۔۔۔ وہ سوچتی رہی کہ یہ سب کیا ہے۔

جس سال اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا' اسی سال ماں بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اس کے بعد اس پر آگہی کے باقی دروازے بھی کھلنے شروع ہو گئے۔ اس وقت اس کی عمر ۱۶ سال تھی۔

شہری اور بنجارے خون کی آمیزش نے اس کی شخصیت کو متضاد بنا دیا تھا۔

عزت اس کے لیے بہت اہم تھی۔۔۔لیکن اسے بے گھری اور دربدری سے خوف نہیں آتا تھا۔اس کی فطرت میں موسیقی اور اداکاری سے محبت شامل تھی لیکن وہ دنیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔وہ بے حد معصوم تھی۔ماں کی موت کے بعد لوگوں کی مہربانی سے وہ نظریں پہچاننے کے قابل ہوگئی۔پڑوس والے فضلو چاچا سے لے کر ان کے پوتے نصیرے تک ہر کوئی اس کے کام آنا چاہتا تھا۔اس کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔۔۔لیکن عزت کے عوض! اسے ماں کی بات یاد آتی رہی۔ایک وقت کی روٹی بھی بڑی مشکل سے ملتی ہے۔

مکان کا کرایہ چڑھتا رہا۔۔۔اور وہ اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارتی رہی۔

میٹرک پاس ہونے کے زور پر اس نے ملازمت کرنا چاہی۔لیکن اچھوتا ہونے کے باوجود اس کا استخوانی' بے رس جسم اس کی راہ میں رکاوٹ بنتا رہا۔یوں اسے یہ پتا نہ چل سکا کہ لڑکیوں کو صرف ملازمت کبھی نہیں ملتی۔ملازمت کے ساتھ ایک آراستہ فلیٹ اور دیگر آسائشات بھی لینا پڑتی ہیں۔۔۔ورنہ ملازمت بھی نہیں ملتی۔

پھر ایک دن مالک مکان نے نوٹس دے دیا کہ اگر وہ اس کی ہو کر رہے تو کرائے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ورنہ فوری طور پر مکان خالی کردے اس نے پلاسٹک کی ٹوکری میں اپنے دو جوڑے کپڑے رکھے اور وہاں سے نکل آئی۔اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔پھر اچانک اسے سرکس کا خیال آیا۔۔۔اور وہ سرکس کی طرف چل دی۔ سرکس میں لوگوں کو کام کرتے دیکھ کر اس کی رگوں میں دوڑنے والا خانہ بدوش خون مچلنے لگا۔وہ گا سکتی تھی۔۔۔وہ جانتی تھی کہ وہ بہت اچھی اداکاری کرسکتی ہے۔وہ منیجر سے ملی۔ماں کے حوالے سے وہ بمشکل اسے کام دینے پر رضامند ہوا۔منیجر نے اس کے لاغر بدن اور مرجھائے ہوئے چہرے کو بہت ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا تھا۔بہر حال' وقتی طور پر اسے تین وقت کا کھانا اور سر چھپانے کا ٹھکانا میسّر آگیا تھا۔

تانیا کو اچانک علم ہوا کہ اسے اداکاری کا شوق ہے یہ شوق پہلی بار اس کے شعور کی سطح پر اُبھر کر آیا تھا۔اس نے خود سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ کرلیں۔ اب پہلی بار اسے شاداب جسم کی اہمیت کا احساس ہوا۔سرکس میں عموماً اسے کسی ایکٹ کے دوران کسی مسخرے کے ساتھ اسٹیج پر بھیجا جاتا تھا۔۔۔کامیڈی کرنے کے لیے۔مسخرا اس کی معصومیت سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو خوب ہنساتا تھا اور داد سمیٹتا تھا۔۔۔لیکن تانیا کی معصومیّت کبھی تماشائیوں کے دلوں کو نہ چھوسکی۔اس پر فقرے چُست کیے جاتے' پھبتیاں کسی جاتیں۔بالآخر ایک رات منیجر نے اسے جواب دے دیا۔

''تم بالکل مرگھلی ہو لڑکی۔۔۔ہڈیوں کی مالا۔'' منیجر نے کہا۔''آج بھی تماشائیوں میں سے کسی نے تمہیں گنجی مرغی کہہ کر پکارا تھا۔ مجھے افسوس ہے۔لیکن اب میں تمہیں کام نہیں دے سکتا۔کسی لڑکی کو اگر ناچنا گانا نہ آتا ہو' تب بھی کام چل سکتا ہے۔بشرطیکہ وہ۔۔۔خوب صورت ہو، تمہارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے تانیا۔''

اور یہ بات سچ بھی تھی۔تانیا کو دیکھ کر صرف رحم کا جذبہ بیدار ہوتا تھا' جب کہ تماشائی کچھ اور دیکھنے آتے ہیں۔

منیجر کے جانے کے بعد تانیا نے قدِ آدم آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ساری امیدیں ختم ہوچکی تھیں۔اس کی ماں نے کہا تھا کہ عزت سے ایک وقت کی روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے۔لیکن تانیا کو تو بے عزتی سے بھی ایک وقت کی روٹی ملنا مشکل تھی۔ وہ تو خود کو بیچنا بھی چاہتی تو خریدار نہ ملتا۔اس نے اپنے عکس کو سرتاپا دیکھا اور اس کا وجود مایوسی سے بھر گیا۔اس نے اپنے کپڑے ٹوکری میں رکھے اور ٹوکری لے کر باہر نکل آئی۔باہر اس کی ساتھی لڑکیاں موجود تھیں۔شاداب جسموں والی وہ حسین لڑکیاں چہک رہی تھیں۔وہ اسٹیج پر جاتی تھیں تو لوگ انہیں دیکھ کر سیٹیاں بجاتے

تھے۔ یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔ یہ بات نہیں کہ تانیا کو اپنی آمد پر سیٹیاں سننے کی آرزو تھی۔ بات اتنی سی تھی کہ وہ سیٹیاں زندگی کی۔۔۔ روزگار کی علامت تھیں۔ ان کے بغیر کوئی لڑکی۔۔۔ بے سہارا لڑکی صرف موت کی آرزو کر سکتی تھی۔۔۔ اُس کی طرح!۔

وہ ساحل کی طرف چل دی۔۔۔ اپنی باسکٹ اٹھائے۔ اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور چہرے پر وہ مایوسی تھی' جو صرف' موت کی طرف بڑھنے والوں کے چہرے پر نظر آتی ہے۔

منیجر نے اُسے دیکھا۔۔۔ اور اس کا دل رحم کے جذبے سے سرشار ہو گیا۔ اسے وہ ایک ننھی سی بچی لگی' جو چاند کی آرزو کر رہی تھی۔۔۔ لیکن اس کے سارے کھلونے ٹوٹ چکے تھے۔ منیجر کا جی چاہا کہ اپنا فیصلہ تبدیل کر دے لیکن وہ ہچکچا رہا تھا۔ دنیا قابلِ رحم لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ انسان کس کس پر رحم کھائے لیکن وہ جانتا تھا کہ اِس معصوم لڑکی میں ایک بے نام کشش موجود ہے۔۔۔ لیکن وہ کشش ہر ایک کو محسوس نہیں ہو سکتی۔ کم از کم سرکس کے تماشائیوں کو ہرگز محسوس نہیں ہو سکتی۔ وہ تو کچھ اور ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔

''تانی۔۔۔ اے تانی' یہاں آؤ۔'' اس نے پکارا۔۔۔ لیکن ہچکچاہٹ کے ان لمحوں میں تانیا خاصی دُور جا چکی تھی۔ منیجر نے کندھے جھٹکے اور اپنے خیمے میں چلا گیا۔

تانیا ساحل کی طرف بڑھتی رہی۔۔۔ اس ارادے کے ساتھ کہ اس کے قدم گہرے پانی میں بھی نہیں رکیں گے۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن وہ دیکھ

کچھ نہیں رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ جیتے جی مر چکی ہے۔۔۔ اور اب مرنے کی محض رسم پوری کرنے جا رہی ہے۔ اس کی نگاہوں میں اپنی ماں کا تھکا تھکا چہرہ اُبھرا۔ پھر اسے اسکول کی سہیلیاں یاد آئیں۔ گزرا ہوا وقت۔۔۔ باپ کی محبت اور خوشحالی و بےفکری کا دور۔ ایسا لگتا تھا' جیسے کسی اندھی دیوار میں اچانک دروازہ کھل گیا ہے اور وہ ماضی کے چمن زار میں داخل ہو گئی ہے' جہاں رنگا رنگ مہکتے پھول ہیں۔۔۔ لمحوں کے پھول۔۔۔ اور ان پھولوں پر تھرکتی ہوئی تتلیاں ہیں۔۔۔ یادوں کی تتلیاں۔ وہ سب یاد کرتی رہی۔۔۔ اور زندگی سے دور ہوتی' موت کی طرف بڑھتی رہی۔ ماضی کا حُسن اپنی جگہ۔۔۔ لیکن ناکامی کی راکھ سے کبھی زندگی کے گھروندے تعمیر نہیں کیے جا سکتے۔ اس کا زادِ سفر صرف خوشگوار یادیں ہی تو تھیں۔

کلفٹن کے میلے کی روشنیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ لیکن چاندنی نے رات کے سیاہ دل کو منور کر رکھا تھا۔ اچانک کسی نے باریک چیختی آواز میں پکارا۔ ''اے لڑکی۔۔۔ باسکٹ والی۔ تم کہاں جا رہی ہو۔۔۔ اور اتنی جلدی کیا ہے؟''

تانیا کے قدم رُک گئے۔ وہ بری طرح چونکی۔ مخاطب اسی کو کیا گیا تھا۔۔۔ لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ آواز کہاں سے آئی۔ درحقیقت اسے بہت زور کا غصہ آیا تھا۔ وہ آواز اسے اس اذیّت ناک دنیا میں واپس کھینچ لائی تھی' جس سے وہ اپنا ہر شعوری ناتا توڑ چکی تھی۔ اس آواز نے اس کا راستہ کھوٹا کیا تھا۔

اس نیم تاریکی میں دوسرے جملے نے اسے بُری طرح دہلا دیا۔ ''سمندر کی تہ میں بہت سردی ہو گی لڑکی۔۔۔ اور خونخوار مچھلیاں تمہارا سارا گوشت نوچ لیں گی۔ وہ تمہاری خوب صورت آنکھیں بھی نوچ کر کھا جائیں گی۔'' وہی باریک سماعت میں اُترتی ہوئی آواز سنائی دی۔

شاید یہ خانہ بدوش ماں کے خون کا اثر تھا کہ وہ بہت توہم پرست تھی اور

ارواح پر یقین رکھتی تھی۔ اس نے پلٹ کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ بولنے والے کو کھوج سکے۔

کچھ دور پیٹرومکس کی روشنی میں اسے پتلی تماشے کا اسٹال نظر آیا۔ پیشانی پر تحریر تھا' مفلس خان اور اہلِ خانہ۔ اسٹال کے سامنے والے حصے میں چار فٹ کی بلندی پر ایک اسٹیج بنا ہوا تھا' جس پر باقاعدہ تھیٹر جیسا پردہ بھی تھا۔ پردہ اس وقت اطراف میں سمٹا ہوا تھا۔ اس کے برابر خانہ بدوش نجومی کا اسٹال تھا۔ جہاں دو خانہ بدوش میاں بیوی آپس میں شاید پیسوں کے لیے تکرار کر رہے تھے۔ ساتھ ہی کولڈ ڈرنک کا اسٹال تھا۔ اس کے سامنے مشروبات سے بھری ہوئی اور خالی بوتلوں سے لدا ہوا ایک ٹرک کھڑا تھا۔۔۔ اور دو آدمی شاید بوتلوں کے کریٹ تبدیل کر رہے تھے لیکن تانیا نے محسوس کیا کہ اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہے۔ پھر وہ آواز کہاں سے آئی تھی؟

وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ چہکتی ہوئی آواز پھر اُبھری۔ ''آخر تم پر کیا قیامت ٹوٹی ہے۔ محبوب نے دھوکا دے دیا ہے کیا؟ اگر ایسا ہے تو غم مت کرو اور بہت مل جائیں گے۔''

اس بار تانیا نے دیکھ لیا کہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ پتلی تماشے والے اسٹال کے اسٹیج پر ایک پُتلی موجود تھی۔ وہ بھورے بالوں اور بھوری آنکھوں والا ایک لڑکا تھا' جو اُسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تجسس کا تاثر تھا۔ تانیا کو کم از کم ایسا ہی لگا۔ پیٹرومکس کی روشنی میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''اے۔۔۔ کیا تمہاری زبان بلی کھا گئی ہے۔'' وہ پھر چیخا۔ ''تمہیں آداب نہیں آتے۔ میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں تم جواب کیوں نہیں دیتیں۔''

تانیا ڈر گئی۔ اس نے باسکٹ زمین پر رکھ دی۔ چند لمحوں میں اس کی

حالت معمول پر آئی تو اس نے اپنی باسکٹ اٹھائی اور اسٹال کی طرف بڑھ گئی۔ اسٹال کے بہت قریب پہنچ کر اس نے اس مختصر مخلوق کا تفصیلی جائزہ لیا۔ پھر اسے توہین کا احساس ہونے لگا۔ پُتلی نے کس قدر اہم کام میں مداخلت کی تھی۔

''آداب کی بات کرتے ہو تم۔'' اُس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''ذرا یہ تو بتاؤ کہ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانا بدتمیزی ہے یا نہیں۔''

پُتلی نے بے حد محتاط انداز میں اسے سرتاپا دیکھا۔ ''اوہ' بے روزگاری سے تنگ آ چکی ہو' اسی لیے اس قدر تلخ ہو رہی ہو۔ بے بی' میں نے یونہی ہمدردی میں تمہیں پکار لیا تھا۔ بور ہو رہا تھا' سوچا' تمہارے ہی ساتھ کچھ وقت گزارا جائے۔''

''واہ بھئی واہ۔۔۔ جان نہ پہچان' خواہ مخواہ بے تکلف ہوئے جا رہے ہو۔'' تانیا نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اور یہی نہیں۔۔۔ ذاتیات پر بھی گفتگو کر رہے ہو۔ اگر میں بھی تم سے نجی نوعیت کے۔۔۔۔۔'' اچانک وہ ٹھٹک گئی۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ ایک بے جان کٹھ پتلی سے ہم کلام ہے۔۔۔ ایسے' جیسے وہ کوئی جیتا جاگتا انسان ہو لیکن یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ وہ جس صورتِ حال سے دوچار تھی۔۔۔ اور جو اس کی ذہنی کیفیت تھی' اس کے پیش نظر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ لکڑی کے اس پُتلے کے چہرے پر ماہرانہ انداز میں رنگ کیا گیا تھا۔ اس کا سر ذرا اِدھر اُدھر ہلتا تو ایسا لگتا کہ اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا ہے۔ تانیا نے کبھی کٹھ پتلی کا تماشا دیکھا بھی نہیں تھا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' کٹھ پُتلی نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔ ''تعارف بھی کوئی بڑی بات نہیں۔ مجھے تو اپنے بارے میں گفتگو کرنا اچھا لگتا ہے۔ میری جیون کہانی سنو گی۔ میرا نام ہیرو ہے اور میں صنوبر کے تنے میں پیدا ہوا تھا۔۔۔''

تانیا کو آہٹ سی محسوس ہوئی۔۔۔ اور دوسرے ہی لمحے ایک نسوانی پُتلی

اسٹیج پر نمودار ہوئی۔ وہ بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ سنہرے بال اس کے شانوں پر جھول رہے تھے۔ بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں حیرت اور تجسس تھا۔ چھوٹا سا دہانہ اور بھرے بھرے خوب صورت ہونٹ۔۔۔

اس نے کئی بار سر اٹھایا اور جھکایا۔۔۔ گویا تانیا کا معائنہ کر رہی ہو۔ پھر اس نے مرد پتلی سے کہا۔ ''خدا کی پناہ۔۔۔ ہیرو' یہ تمہیں کہاں مل گئی؟''

ہیرو نے فخر آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''اچھی ہے نا؟''

''خدا کی پناہ ہیرو۔۔۔ باؤلے ہوئے ہو کیا؟'' لڑکی باریک آواز میں چلائی۔

''تمہارے خیال میں یہ خوب صورت ہے! ارے۔۔۔ ہڈیوں اور کھال کے سوا اس کے پاس کچھ بھی تو نہیں ہے۔''

ہیرو نے سر جھٹکا اور تانیا کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''چمپا!۔۔۔ میں مانتا ہوں کہ یہ لڑکی بہت لاغر ہے' لیکن دیکھو تو سہی' اس کی آنکھیں کتنی بڑی بڑی اور خوب صورت ہیں' اس کے علاوہ اس میں ایک ایسی خوب صورتی بھی ہے جسے میں محسوس تو کرتا ہوں لیکن تمہیں سمجھا نہیں سکتا۔''

''مجھے تو یہ بالکل گنوار لگتی ہے۔'' چمپا نے بے حد خراب لہجے میں کہا اور منہ یوں آسمان کی طرف اٹھایا' جیسے خدا سے فریاد کر رہی ہو۔ اس کے چہرے پر بدمزگی کا تاثر تھا۔

''گنوار تو نہیں البتہ گاؤں کی سیدھی سادی لڑکی لگتی ہے۔'' ہیرو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''پھر بھی' مجھے تو۔۔۔۔''

اب بات تانیا کی برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ وہ بے حد خود دار لڑکی تھی۔ وہ پاؤں پٹختے ہوئے چلائی۔ ''تم دونوں اپنی جرأتیں تو دیکھو۔ میرے سامنے کھڑے مجھ پر کس دیدہ دلیری سے تبصرے کر رہے ہو۔ غضب خدا کا۔۔۔ کچھ

دیر پہلے تم ادب اور تمیز کی باتیں کر رہے تھے۔ کیا یہ بدتمیزی نہیں' جو تم کر رہے ہو۔''

ہیرو نے مفکرانہ انداز میں سر ہلایا اور فکر مند نظر آنے لگا۔ ''میرا خیال ہے' تم ٹھیک کہہ رہی ہو؟'' اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ''ان دنوں ہم لوگ کچھ زیادہ ہی بدتمیز اور منہ پھٹ ہو گئے ہیں۔ شاید ہمیں گوشمالی کی ضرورت ہے۔ کیوں نہ تم ہمارے سامنے ذرا ڈھنگ کی ڈانٹ ڈپٹ کرو۔''

''میں باز آئی۔ کوؤں کو ڈرانے والی پتلی سے ڈانٹ ڈپٹ سُننا میرے بس سے باہر ہے۔ میں چلی۔'' چمپا نے اِترا کر کہا اور غوطہ لگا کر غائب ہو گئی۔

ہیرو نے بڑی افسردگی سے سر ہلایا اور بولا۔ ''چمپا کا دماغ کچھ زیادہ ہی خراب ہو گیا ہے۔ غرورِ حسن بھی بہت بُری چیز ہوتی ہے۔ خیر۔۔۔ تم ڈانٹ ڈپٹ کرو نا۔ میں اپنی توہین کا بڑی بے چینی سے منتظر ہوں۔ میں جب کوئی غلط کام کرتا ہوں تو اس کی سزا بھگتنے کے لیے بھی تیار رہتا ہوں۔''

تانیا کے لبوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ اُبھری۔ ''نہیں۔۔۔ میں تمہاری توہین نہیں کروں گی۔ تم مجھے اچھے لگے ہو۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''اچھا۔۔۔ کیا سچ کہہ رہی ہو؟'' ہیرو خوش نظر آنے لگا۔ ''اس کا مطلب ہے' مجھے کچھ سوچنا چاہیے۔ سنو۔۔۔ میں تم سے پھر ملوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ بھی غائب ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی ایک لومڑ پتلی نمودار ہوئی۔ اس کا رنگ سُرخ، ناک نکیلی تھی اور باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں عیاری کی چمک تھی اور آواز اور لہجے میں عیاری کا تاثر آنکھوں سے بھی زیادہ تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے پھاڑ کھانے والے انداز میں تانیا کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہیلو' پیاری لڑکی۔''

تانیا نے اسے بری طرح گھورتے ہوئے کہا۔ ''اے۔۔۔ مجھ سے بے تکلف ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم صورت ہی سے چالاک اور اچکے نظر آتے ہو۔''

لومڑ نے سر گھمایا۔ ایسا لگتا تھا' جیسے اسے اس تبصرے سے دلی تکلیف پہنچی ہو۔ ''میں ایسا نہیں ہوں۔'' اُس نے زخمی لہجے میں کہا۔ ''میں کیا کر سکتا ہوں۔ میری صورت ہی ایسی ہے یہاں آؤ' میں تمہیں سمجھاؤں۔ ذرا اپنا ہاتھ بڑھاؤ۔''

تانیا اسٹال کے اور قریب ہو گئی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ لومڑ کی طرف بڑھایا۔ انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ وہ کچھ فکر مند نظر آ رہی تھی۔۔۔۔ لیکن پُتلیوں نے بہر حال' اسے مسحور کر لیا تھا۔

لومڑ نے اپنی ٹھوڑی اُس کی ہتھیلی کے پیالے میں رکھ دی' پھر وہ ٹھوڑی سے اس کی ہتھیلی کو سہلانے لگا۔ ''دیکھو۔۔۔ تم مجھے کس قدر غلط سمجھ رہی تھیں۔ میں تو محبت کا بھوکا ہوں' ازل سے میری صورت ہی ایسی ہے کہ کوئی مجھ سے محبت نہیں کرتا۔'' اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔

تانیا اُس عیار لومڑ کی باتوں میں آنے والی کہاں تھی' جھٹ بولی۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ میں تمہیں غلط سمجھی تھی۔ میں تم جیسوں کو خوب جانتی ہوں۔''

''نہیں۔۔۔ تم نہیں جانتیں۔'' لومڑ نے اصرار کیا۔ وہ اب بھی اس کی ہتھیلی کو ٹھوڑی سے سہلا رہا تھا۔ ''میں دل کا بہت اچھا ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ مجھ پر کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ تم مجھ پر اعتبار کرو گی؟ کرو گی نا؟''

تانیا جواب دینے والی تھی کہ وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے' اسی وقت لومڑ نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہ یقیناً دُھندلی روشنیوں اور رقص کرتے ہوئے سایوں کا کرشمہ رہا ہو گا لیکن کم از کم تانیا کو ایسا لگا' جیسے لومڑ کی آنکھوں میں ایک تڑپ سی اُبھر آئی ہے۔۔۔ اس کے چہرے پر التجا کا تاثر ہے' جیسے وہ کہہ رہا ہو۔۔۔ خدا کے لیے' مجھ پر اعتبار کرو۔ میں اس نعمت کو ترس رہا ہوں۔ میں تمہیں کبھی دھوکا نہیں

دوں گا۔

اس احساس نے تانیا کے معصوم دل کو چھو لیا۔ وہ تڑپ کر بولی۔ ''ہاں۔۔۔ میں تم پر اعتبار کروں گی۔'' اس کے لہجے میں بے پایاں خلوص تھا۔۔۔ سچائی تھی۔ وہ بھول گئی کہ کن حالات سے دوچار ہے۔۔۔ اور کس ارادے سے ساحل کی طرف جا رہی تھی۔ اسے تو جیسے کسی اَن دیکھی ڈور نے باندھ لیا تھا۔۔۔ کٹھ پتلیوں ہی کی طرح۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ پتلی تماشے کے اسٹال پر۔۔۔ اسٹیج کے قریب کھڑی ایک لومڑ پتلی سے بات کرتی ہوئی کتنی عجیب لگ رہی ہو گی۔ جانوروں سے' پرندوں سے' درختوں سے اور پانی کے بہتے ہوئے چشموں سے محبت کی خُو اسے اپنی خانہ بدوش ماں سے ورثے میں ملی تھی۔ اپنے دل کے بھید۔۔۔ اپنے وجود کے راز اُس پر آہستہ آہستہ کھل رہے تھے۔

''مجھے معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن مجھے ایک بے حد معصوم لڑکی ملے گی۔'' لومڑ نے سرد آہ بھر کے کہا۔ ''بی بی' تمہارا نام کیا ہے؟''

''تانیا۔''

''خوب صورت نام ہے۔'' لومڑ نے تبصرہ کیا۔ ''مجھ سے ملو۔ میرا نام چالباز ہے۔ مجھے اپنے ماں باپ سے عمر بھر شکایت رہے گی کہ انہوں نے میرا اس قدر نامعقول نام رکھا۔ تمہی بتاؤ۔ اس نام کے ہوتے ہوئے کوئی مجھ پر اعتبار کر سکتا ہے۔۔۔ کوئی مجھ سے محبت کر سکتا ہے۔''

''واقعی۔۔۔ تمہارے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔'' تانیا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

لومڑ نے سر اُٹھایا۔ اس کا سر ایسے زاویے پر تھا کہ وہ تانیا کو کن انکھیوں سے دیکھتا محسوس ہو رہا تھا۔ ''کہاں کی رہنے والی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''کراچی کی۔۔۔۔ میری ماں خانہ بدوش تھی۔'' تانیا نے جواب

دیا۔

لومڑ کی آنکھوں میں عیاری کی چمک لہرا گئی۔ ''کتے سے اس وقت ہوشیار رہو' جب وہ سو رہا ہو۔'' اس نے شریر لہجے میں کہا۔ ''شرابی سے اس وقت ڈرو' جب وہ دعا مانگ رہا ہو۔ لیکن خانہ بدوشوں کے روبرو ہمہ وقت چوکنا رہو۔ بزرگوں نے کہا ہے۔۔۔۔''

''غضب خدا کا۔۔۔ یہ بات لومڑ کہہ رہا ہے۔'' تانیا نے تُرکی بہ تُرکی کہا۔ ''بزرگوں نے کہا ہے کہ جب کوئی لومڑ واعظ بننے کی کوشش کرے تو سمجھ لو کہ تم لٹنے والے ہو۔'' پھر اُس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

چالباز نے زوردار قہقہہ لگایا اور اسٹیج پر دائیں جانب کھسک گیا۔ ''بے بی۔۔۔ دیکھنے میں تو تم ڈھانچہ لگتی ہو۔۔۔ لیکن اس ڈھانچے میں حوصلہ بھی ہے اور جاندار روح بھی۔'' اس نے ستائشی لہجے میں کہا اور پھر سر جھکا کر تائید طلب انداز میں بولا۔ ''کیوں دوستو۔۔۔۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟'' وہ ان دو ٹرک والوں سے مخاطب تھا' جو بوتلوں کے کریٹ اتارنے چڑھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔'' ان میں سے ایک نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

چالباز نے پھر قہقہہ لگایا اور اسٹیج کے عقب میں کسی کو پکارا۔

''رستم۔۔۔ اے رستم' یہاں آؤ۔ دیکھوں۔۔۔ تم اسے ڈرا سکتے ہو یا نہیں۔''

اسی لمحے اسٹیج پر ایک دیو قامت پُتلا اُبھر آیا۔ اس کے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ وہ تانیا کو گھورنے لگا۔ جواباً تانیا نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

چالباز نے ان کا تعارف کرایا۔ ''یہ ہے ہمارا شہزور رستم۔۔۔ اور رستم' یہ لڑکی تانیا ہے۔ یہ مجھ پر مرمٹی ہے۔''

تانیا اس بات کی تردید کرنے والی تھی لیکن یہ سوچ کر رُک گئی کہ دیکھا تو جائے' کیا ہوتا ہے۔ دیو قامت رستم بدستور تانیا کو گھور رہا تھا۔ پھر جیسے وہ ذہن پر

زور ڈالنے لگا۔ ''مکشونکا شا۔۔۔ نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ مشکو کنا شا۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ بھی نہیں۔'' پھر وہ اپنے سر پر دو ہتڑ مار کر بولا۔ ''ہمیشہ بھول جاتا ہوں۔ خدا جانے کیا مصیبت ہے۔''

تانیا کو ایک پرانی فلم یاد آ گئی' جس میں ایک دیو کا یہ تکیہ کلام تھا۔۔۔ ''نکشو مکا شا۔'' اس نے رستم کو یاد دلایا۔

''ہاں۔۔۔ نکشو مکا شا۔'' رستم نے بے حد خوش ہو کر کہا۔

''نکشو مکا شا۔۔۔ میں ایک دیو ہوں۔ لیکن۔۔۔۔'' اچانک وہ مایوس نظر آنے لگا۔ ''لیکن فائدہ کیا ہے۔ تم مجھ سے ڈر ہی نہیں رہی ہو۔''

تانیا نے بڑی معصومیت سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر گویا دھڑکنیں چیک کیں پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے افسوس ہے۔۔۔ لیکن مجھے واقعی تم سے ڈر نہیں لگ رہا ہے۔''

''افسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔'' رستم نے دلگیر لہجے میں کہا۔ ''یہ ڈرانے کا کام تو مجھ پر تھوپ دیا گیا ہے۔ ورنہ میں تو دوست بنانا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ میرے سر میں بہت خشکی ہو گئی ہے۔ کھجلی ہوتی رہتی ہے۔ تم میرا سر کھجا دو گی اچھی دوست۔''

تانیا نے بڑی محبت سے اس کا چوبی سر سہلانا شروع کر دیا۔ رستم غنودہ لہجے میں واہ واہ کرنے لگا۔ اس کے اس بچکانہ انداز نے تانیا کے دل کو چھو لیا اسے ایسا لگا' جیسے اُسے اس کے مطلب کے لوگ مل گئے ہیں۔ ناکامی اور مایوسی کا احساس ڈھل گیا تھا۔

دفعتاً چالباز سر جھکاتے ہوئے چلایا۔ ''میرا سر بھی سہلاؤ۔ میرا سر بھی۔۔۔'' انداز اس بچے کا سا تھا' جسے خود کو نظر انداز کیا جانا بُرا لگا ہو۔ پھر اس نے تانیا کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔

اچانک ایک کھٹارا سی وین کٹھ پتلیوں کے اسٹال کے سامنے آ کر رُکی۔ اس کا پینٹ جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ سے ایک بدہیئت شخص اترا اور وین کے پچھلے حصے سے ایک بڑا ٹرنک اُتارنے میں مصروف ہوگیا۔ وہ گنجا یک چشم، بھاری بھرکم اور پستہ قامت آدمی تھا۔ اس کا جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ بتاتا تھا کہ اس کی عمر ساٹھ سال سے کم نہیں ہے۔ سونے کے دانتوں کی بتیسی بتاتی تھی کہ اس نے کبھی بہت اچھے دن بھی دیکھے ہوں گے اس کی خراب آنکھ پر میلا چیکٹ غلاف تھا' جس کی وجہ سے وہ بہت خوف ناک لگ رہا تھا۔ حالاں کہ اس کے گول مٹول چہرے پر' جو اس کے گول مٹول جسم سے پوری طرح ہم آہنگ تھا' بلا کی معصومیت تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بچوں کی سی معصوم مسکراہٹ تھی۔ قمیص کی جیب میں ایک ماؤتھ آرگن رکھا نظر آ رہا تھا۔

اس نے اسٹیج پر دزدیدہ نظر ڈالی اور خوشگوار لہجے میں بولا۔ ''اوہ۔۔۔ چالباز' اس بار تم نے کیا چکر چلایا ہے۔ تمہیں تو بس موقع ملنا چاہیے۔ تمہیں دو منٹ اکیلا چھوڑ دوں تو تم اتنی دیر میں کسی نہ کسی لڑکی کے چکر میں پڑ جاتے ہو۔''

''زبان سنبھال کر بات کرو گولو۔'' چالباز نے اسے ڈانٹ دیا۔ ''اور ہاں۔۔۔ شام کو جب تم تماشے کے بعد پیسے سمیٹ رہے تھے تو تم نے نظر بچا کے ایک اٹھنی جیب میں ڈال لی تھی۔ نکالو اٹھنی۔''

گولو نے ستائشی نظروں سے لومڑ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یار چالباز۔۔۔ تم ہو بہت تیز سب کچھ دیکھ لیتے ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے جیب سے اٹھنی نکال کر اسٹیج پر پھینکی۔

لومڑ تیزی سے اٹھنی کی طرف لپکا۔ ''دیکھا تم نے۔'' اس نے تانیا سے کہا۔ ''یہاں ایک میں ہی دیانت دار ہوں۔ باقی سب ہیرا پھیری کرتے ہیں۔

لیکن کیا کروں۔ بدنام ہوگیا ہوں۔'' پھر وہ گولو کی طرف مڑا۔ ''گولو۔۔۔ یہ لڑکی میری دوست ہے۔ اس کا نام تانیا ہے۔ ہم دونوں شادی کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ اور تانیا۔۔۔ یہ گولو ہے۔۔۔ ہمارا میوزک ڈائریکٹر۔''

تانیا نے گولو کو بڑے ادب سے سلام کیا۔ جواباً گولو نے سر خم کرتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر اُس کی انگلیوں کو یوں چوما جیسے وہ کوئی شہزادی ہو۔

''اے گولو۔۔۔ یہ کیا حرکت ہے۔'' چالباز نے گولو کو ڈانٹا۔ ''تم تو میری منگیتر کا دماغ خراب کر دو گے۔ ہٹو ایک طرف۔'' پھر وہ تانیا سے مخاطب ہو گیا۔ ''بے بی۔۔۔ ایک بات بتاؤ' تمہیں گانا آتا ہے۔''

''رونا اور گانا کسے نہیں آتا۔'' تانیا نے جواب دیا۔ ''تم بھی گاتے ہو؟''

''ارے۔۔۔ یہ کیا پوچھ لیا تم نے؟ میں اس ملک کا سب سے بڑا گلوکار ہوں۔ ایک بار میں نے گانے کے زور سے مہدی حسن کا تان پورہ توڑ دیا تھا۔ میرا ایک دوست بھی گلوکار ہے۔ تمہیں ملا کر تگڑم بن جائے گی۔ اے رستم۔۔۔ ذرا راگی کو بھیجو۔ اور گولو۔۔۔ تم کوئی اچھی سی دُھن بجاؤ ہمارے لیے۔''

رستم اسٹیج سے غائب ہوگیا۔ اس کی جگہ ایک اور پتلی اتر آئی' جس کا اوپری حصہ کسی بُلبُل سے مشابہ تھا۔ ''یہ ہے میرا دوست گویا راگی۔'' چالباز نے تعارف کرایا۔ ''یہ بھی اس اکیڈمی کا ممبر ہے۔''

بُلبُل نما پُتلی نے بڑی ادا سے سر کو خم کیا اور مترنم آواز میں بولا۔ ''تم سے مل کر خوشی ہوئی تانیا۔''

گولو نے ماؤتھ آرگن منہ سے لگایا۔۔۔ اور اگلے ہی لمحے فضا میں سحر انگیز موسیقی گونجنے لگی۔ وہ ایک جانی پہچانی دُھن تھی تانیا بلا ارادہ گانے لگی۔ ''سوہنی دھرتی' اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے۔۔۔۔۔ قدم قدم آباد۔'' اس فضا نے اس پر

سحر طاری کر دیا تھا۔ وہ اپنی خانماں بربادی بھول گئی تھی۔۔۔ اور سوہنی دھرتی کی آبادی کی دُعا دے رہی تھی۔ اس کی آواز بہت اچھی اور نکلتی ہوئی نہیں تھی تاہم اس میں غیر معمولی نرمی اور روح کی سچائی سے اُبھرنے والی نغمگی بے حد واضح تھی۔ چالباز اور راگی اس کی آواز میں آواز ملا رہے تھے۔ ''تیرا ہر اک ذرہ ہم کو اپنی جان سے پیارا۔''

اس نغمے کے دوران تانیا کھو سی گئی۔ وہ اُن وادیوں اور مرغزاروں کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، جنہیں اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہاں سب کچھ بے حد خوب صورت تھا۔ زندگی بے حد خوب صورت تھی۔۔۔ اور سمندر کی تہ میں موت کی تاریکی تھی۔۔۔ اور تیز نوکیلے دانتوں والی خونخوار مچھلیاں تھیں۔

نغمے نے اردگرد کے لوگوں کو متوجہ کر لیا تھا۔ خانہ بدوش نجومی میاں بیوی اپنا جھگڑا بھول کر اسٹال پر چلے آئے تھے اور اب تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان کی سیاہ آنکھوں میں اُتری ہوئی چاندنی نے انہیں بے حد روشن بنا دیا تھا۔ ٹرک ڈرائیور اور دونوں مزدور بھی آ کھڑے ہوئے تھے۔۔۔ اور تال ملا رہے تھے۔ ساحل کے مزار کی طرف جانے والی ایک خالی ٹیکسی کے ڈرائیور نے گاڑی روک دی تھی اور اسٹال کی طرف چلا آیا تھا۔ ساحل کی طرف سے آنے والے کچھ لوگ بھی آ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ بچے بھی تھے، جو مسحور ہو کر پتلی تماشا دیکھ رہے تھے۔ اسٹال کے سامنے نیم دائرے کی صورت میں کافی تماشائی اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ سب مسحور ہو کر پتلی تماشا دیکھ رہے تھے۔ تماشا ان کے لیے نیا نہیں تھا۔۔۔ لیکن تماشے میں وہ اضافہ انہیں پسند آیا تھا۔۔۔ خوبصورت لگا تھا۔۔۔ وہ دُبلی پتلی لڑکی جو اُن کی موجودگی سے بے خبر یوں معصومیت سے کٹھ پتلیوں میں الجھی ہوئی تھی، جیسے وہ انہی میں سے ایک ہو۔ اس کے انداز میں بے ساختگی تھی۔ وہ ایک جیتی جاگتی اور نسبتاً بڑی کٹھ پتلی معلوم ہو رہی تھی۔

اس مختصر سے وقفے میں تانیا کا وجود ایک بڑی کیمیائی تبدیلی سے گزر رہا تھا۔ مایوسی کے بادل چھٹ چکے تھے۔ محرومی کا احساس مٹ گیا تھا۔ وہ بے خودی کے عالم میں گا رہی تھی۔ گانے کے دوران کبھی وہ چالباز کی طرف دیکھتی اور کبھی راگی کی طرف اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں چاندنی کے پھول کھل رہے تھے۔ نغمہ ختم ہوا تو تماشائیوں نے تالیاں بجا کر انہیں بے ساختہ داد دی لیکن تانیا کو کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ اُسے تو یہ بھی پتا نہیں چلا کہ گولو کاسہ لے کر تماشائیوں کے پاس گیا ہے۔۔۔ اور وہ اس کاسے میں اپنی اپنی حیثیت کے مطابق سکے ڈال رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے نوٹ بھی دیے تھے۔ وہ تو بس چالباز اور راگی کو دیکھے جا رہی تھی، جو تماشائیوں کی داد و تحسین کے جواب میں جھک جھک کر گویا آداب بجا لا رہے تھے۔

''آج تو تم نے کمال کر دیا چالباز۔'' راگی نے لومڑ کو داد دی۔ ''آج تمہاری آواز پر غضب کا نکھار تھا۔''

''اور تمہاری تعریف کرنے کے لیے مجھے الفاظ ہی نہیں مل رہے ہیں میرے دوست۔'' چالباز نے جواباً داد دی۔ پھر وہ تانیا کی طرف متوجہ ہوا۔ ''میں تم میں ایک فنکار چھپا دیکھ رہا ہوں۔''

تانیا کا دل شکر گزاری اور فخر کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ زندگی میں پہلی بار اُس کی پذیرائی ہوئی تھی۔۔۔ اُس کی فنکارانہ صلاحیت کو داد دی جا رہی تھی۔

''بے بی! تمہاری آواز میں ایک انوکھی کشش ہے۔ بس بات اتنی سی ہے کہ تم خود اس سے ناواقف ہو۔۔۔ اور اپنی آواز کو استعمال کرنا نہیں جانتیں۔'' راگی نے کہا۔

اسٹیج کے نیچے کہیں گھنٹی بجی۔ ''اوہ۔۔۔ کھانے کا وقت ہو گیا۔'' چالباز

نے چیخ کر کہا۔ ''تم سے مل کر خوشی ہوئی بے بی۔ پھر ملیں گے۔ آؤ راگی چلیں۔''

وہ دونوں نیچے غوطہ لگا گئے۔ گولو چند لمحے تانیا کو اپنی اکلوتی آنکھ سے دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھ میں گہری اداسی تھی۔۔۔۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اس آنکھ نے ایک دنیا دیکھی ہوئی ہے۔ ''بے بی۔۔۔ تم کون ہو؟'' بالآخر اس نے پوچھا۔

''میں۔۔۔ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔'' تانیا نے گڑبڑا کر کہا۔

''تم ہمارے لیے خوش بختی لائی ہو۔''

''واقعی؟'' تانیا خوش ہو گئی۔ ''مجھے خوشی ہوئی یہ سُن کر۔۔۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ میں تو خود بدنصیب ہوں۔'' یہ کہتے کہتے وہ اداس ہو گئی۔

''نہیں۔۔۔ تم بدنصیب نہیں ہو۔'' گولو نے اصرار کیا۔ ''معصومیت کبھی بدنصیب نہیں ہوتی کیوں کہ بدنصیبی تو محض ایک داغ ہوتی ہے۔ اب تم کہاں جاؤ گی بے بی؟''

''معلوم نہیں۔'' تانیا نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ گولو کے اس سوال نے اسے سب کچھ یاد دلا دیا۔ وہ کہاں جا رہی تھی۔۔۔ کہاں جانا تھا اسے؟ ہاں۔۔۔ اسے تو جانا تھا۔ پریوں کی کہانی ختم ہوئی۔۔۔ جشن کی رات تمام ہوئی۔ اب پھر سنگین مسائل کی دوپہر سر پر تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں' اس نغمے کی گونج۔۔۔ کٹھ پتلیوں سے اس کی گفتگو کی بازگشت دل میں اب بھی موجود تھی۔ وہ پریشانی کے باوجود خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

گولو نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ لڑکی کے چہرے پر جو تاثر تھا' وہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ بے گھری کے کرب سے آشنا تھا۔ وہ کرب تو اس کی روح کی گہرائیوں میں رچا ہوا تھا لیکن جو شخص اپنے دُکھ کا مداوا نہ کر سکے' وہ دوسرے کے دُکھ پر متاسف ہونے کے سوا کیا کر سکتا ہے۔ ''معاف کرنا بے بی۔۔۔ ابھی مجھے کچھ کام نمٹانے ہیں۔ ہم آج یہاں سے جا رہے ہیں نا؟'' اس نے کہا اور روین سے

اتارے ہوئے صندوق کی طرف بڑھ گیا۔

اسی وقت تانیا کو اپنے عقب میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ اسٹیج پر ایک اور پتلی نمودار ہو گئی تھی۔ وہ ایک بوڑھی عورت تھی' جس کے بالائی ہونٹ کے اوپر رُواں اس قدر بھاری تھا کہ اس نے مونچھوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس کی بھویں بے حد گھنی تھیں۔ ہاتھ میں جھاڑن تھی' جس سے وہ اسٹیج کی صفائی کر رہی تھی۔ تانیا کے پلٹتے ہی اس نے تانیا کو بغور نیچے سے اوپر تک دیکھا اور مکروہ آواز میں سرگوشی کی۔ ''ان میں سے کسی پر اعتبار نہ کرنا۔''

وہ سرگوشی تانیا کو پھر حقائق سے دُور' پتلیوں کی دنیا میں لے گئی۔ ''کس پر اعتبار نہ کروں؟'' اس نے پوچھا۔ لہجے میں حیرت تھی۔

''کسی پر بھی اعتبار نہ کرنا۔'' عورت نے پھر سرگوشی کی۔ ''میں عورت ہوں۔ میں نے عمر گزاری ہے۔۔۔ دنیا دیکھی ہے یقین کرو' میں تمہیں صحیح مشورہ دے رہی ہوں۔''

''لیکن وہ سب اتنے مہربان اور نرم دل ہیں۔۔۔'' تانیا نے احتجاج کیا۔ ''ہُنہہ۔۔۔ یہ سب ان کے ہتھکنڈے ہیں۔ میں بواتمیزن ہوں۔ میں سب جانتی ہوں۔ ان میں سے ایک ایک کو پہچانتی ہوں۔ تم مجھے عزت دار لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ میری بات مانو اور یہاں سے کھسک لو۔ یہ سب بہت بُرے لوگ ہیں۔ تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

تانیا نے بواتمیزن کو غور سے دیکھا۔ اُسے دیکھ کر اس کو اپنے محلے کی زرینہ خالہ یاد آ گئیں۔ وہ جب بھی آتی تھیں' اِدھر اُدھر کی خبریں لاتی تھیں۔ لوگوں کی برائیاں کرنا اُن کا مشغلہ تھا۔ اُن کے جانے کے بعد ماں ہمیشہ کہتی تھی۔ اُن کی بات پر کبھی اعتبار نہ کرنا تانی۔ انہیں دوسروں کی برائی کرنے کی عادت ہے۔ یقین کرو' یہ دوسروں کے گھر جا کر ہماری بُرائی کرتی ہوں گی۔ خدا جانے۔۔۔

عورتوں میں یہ مرض اتنا کیوں ہوتا ہے۔۔۔ اور تانیا ہمیشہ ماں کو یوں دیکھتی، جیسے اُس نے مرد ہونے کا اعلان کر دیا ہو۔

بواتمیزن کو دیکھ کر، اس کی باتیں سُن کر تانیا کو یقین ہو گیا کہ وہ بھی افواہیں پھیلانے کی شوقین عورتوں میں سے ہے۔۔۔ اور ایسی عورتوں کو اُس نے کبھی پسند نہیں کیا تھا۔ اس وقت بواتمیزن کی بات اُس کے دل میں اذیت بن کر چبھی تھی۔ یہ وہی اذیت تھی جو انسان عزیز ترین دوستوں کی برائی سننے پر محسوس کرتا ہے۔

وہ چلائی۔ ''ہرگز نہیں۔ یہ لوگ ایسے نہیں ہیں۔''

گولو نے سر اٹھا کر اسٹیج کی طرف دیکھا اور بواتمیزن کو ڈانٹ دیا۔ ''بوا! تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ یہ لوگ بُرے نہیں ہیں۔ بس ذرا شریر ہیں۔۔۔ اور نوجوانی ہمیشہ شرارت پر اکسایا ہی کرتی ہے۔'' پھر وہ تانیا سے مخاطب ہوا۔ ''بوا کی باتوں پر کان نہ دھرنا بیٹی۔ ابھی میں اسے صندوق میں بند کروں گا تو یہ بکواس کرنا بھول جائے گی۔''

اس دھمکی پر بواتمیزن نے زوردار چیخ ماری اور اسٹیج کے نیچے غوطہ لگا گئی۔ فوراً ہی اس کی جگہ ایک اور پتلے نے لے لی۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا اور صورت سے نہایت شریف معلوم ہوتا تھا۔ اس نے عینک لگا رکھی تھی۔ چہرے پر دوستانہ لیکن الجھن آمیز تاثر تھا۔ اس نے سر گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اس کی نظریں تانیا پر جم گئیں۔ تانیا کو ایسا لگا، جیسے وہ اُس کے آر پار دیکھ رہا ہے۔

''شام بخیر لڑکی۔'' اس نے بے حد مہربان لہجے میں کہا۔ اُس کی آواز میں عجیب طرح کی ملائمت تھی۔ ''میرا نام عقلمند ہے۔۔۔ پروفیسر عقلمند۔ میں کھلونے بناتا ہوں۔۔۔ اور ان کا علاج بھی کرتا ہوں۔ میری بچی۔۔۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم پریشان ہو، میں نے تمہاری آنکھوں کے پیچھے پوشیدہ وہ آنسو دیکھ لیے ہیں، جو تم بہا نہیں سکی ہو۔''

تانیا کا ہاتھ بے ساختہ اپنے گلے پر جا رُکا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کے حلق میں کچھ اٹک رہا ہو۔ کتنا عرصہ ہو گیا تھا۔۔۔ کسی نے اسے میری بچی کہہ کر نہیں پکارا تھا۔

''بے بی۔۔۔ پروفیسر بہت اچھا آدمی ہے۔ اسے سب کچھ بتا دو۔ یہاں ہر شخص اپنے مصائب پروفیسر کے سامنے بیان کرتا ہے۔'' گولو نے کہا۔

تانیا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ بند ٹوٹ گیا ہے۔ یہ اندازہ تو خود اسے بھی نہیں تھا کہ وہ اتنے آنسو چھپائے بیٹھی ہے۔ وہ روتی رہی۔۔۔ اور رُندھی ہوئی آواز میں اپنی کہانی سناتی رہی۔ اسے احساس نہیں تھا کہ وہ لکڑی کے ایک بے جان پتلے کو اپنی بپتا سنا رہی ہے۔ اس کے نزدیک تو وہ ایک مشفق بزرگ تھا، جو پوری توجہ اور گداز کے ساتھ اُسے سُن رہا تھا۔ اس نے بڑی معصومیت اور سچائی کے ساتھ اپنی زندگی اس پر کھول دی۔۔۔ حالاں کہ وہ یہ سب کچھ کسی انسان کو سنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے نزدیک یہ ایک شرمناک حرکت ہوتی۔

جب وہ آنسوؤں، آہوں اور اذیتوں کی یہ داستان سنا چکی تو پروفیسر نے کہا۔ ''اور تم ان مسائل سے ڈر کر سمندر میں پناہ ڈھونڈنے جا رہی تھیں؟''

تانیا حیران رہ گئی۔۔۔ کیوں کہ یہ بات تو اس نے پروفیسر کو بھی نہیں بتائی تھی۔ ''آپ کو کیسے پتا چلا؟'' اُس نے پوچھا۔

''یہ جاننا کچھ مشکل نہیں تھا۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''لیکن لڑکی۔۔۔ سمندر کی تہ میں تم جیسے نوجوان اور اُمنگوں بھرے دلوں کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔''

''لیکن پروفیسر۔۔۔ میں کیا کروں۔ میں کہاں جاؤں؟''

پروفیسر نے سر جھکا لیا اور کسی سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ پھر اس نے اپنی بھوؤں پر متفکرانہ انداز میں ہاتھ رکھا اور سر ٹیڑھا کر کے بولا۔ ''تم ہمارے ساتھ رہو نا۔''

''آپ کے ساتھ رہوں؟ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟'' تانیا نے بے حد خوش ہو کر پوچھا۔ اس کے لیے وہ محض ایک امکان نہیں تھا بلکہ اس کے لیے جنت کا دروازہ کھل گیا تھا۔ وہ تو اتنی ہی دیر میں اُن لوگوں سے گھل مل گئی تھی۔۔۔ بلکہ ان کے لیے محبت محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ سات کٹھ پتلیاں' جو اپنے مزاج اور عادات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔۔۔ اُس کے دل میں گھر کر گئی تھیں۔ اس کے تخیل نے انہیں محبت کرنے والے دردمند دوستوں کے روپ میں دیکھا تھا۔ وہ پتلیاں جیسے اس کے دل کی ڈور سے بندھ گئی تھیں۔ یا شاید وہ حقیقی دنیا کی سنگینیوں سے خوفزدہ ہو کر اپنے تخیل کے دامن میں پناہ لینا چاہتی تھی۔ ''اوہ پروفیسر۔'' اس نے خوشی سے چیخ کر کہا۔ اس کا لہجہ چیخ چیخ گیا۔ ''کیا آپ مجھے اپنے ساتھ شامل کرلیں گے؟''

پروفیسر چند لمحے سوچتا رہا' پھر بولا۔ ''یہ سوال تمہیں ہیرو سے پوچھنا چاہیے۔ وہی اس شو کا انچارج ہے۔ اچھا' اب میں چلتا ہوں۔ اچھی لڑکی۔۔۔ خدا حافظ۔''

کچھ دیر تک اسٹیج خالی رہا۔ تانیا امید وبیم کے درمیان معلق تھی۔ پھر ایک سیٹی کی آواز سنائی دی۔۔۔ اور اُچھلتا کودتا ہیرو اسٹیج پر نمودار ہوا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ تانیا کو دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ ''ارے تانی۔۔۔ تم ابھی تک موجود ہو!''

تانیا سوچتی اور جھجکتی رہی کہ اُس سے مطلب کی بات کیسے کرے۔ یہ تو اسے پتا چل گیا تھا کہ اُس کے مزاج کے موسم بہت تیزی سے بدلتے ہیں۔ اب اس وقت وہ پہلی ملاقات کے مقابلے میں بہت مختلف نظر آ رہا تھا۔ بہرحال' بات تو کرنا ہی تھی۔ ''پروفیسر کہہ رہے تھے کہ۔۔'' اس نے کہنا چاہا۔

''ہاں۔۔۔ میں سُن چکا ہوں۔'' ہیرو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارے شو میں شامل ہو سکتی ہوں؟'' تانیا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ہیرو نے بغور اُسے دیکھا۔ وہ متفکر نظر آنے لگا تھا۔ ''تم نے اتنے خوب صورت انداز میں پوچھا ہے کہ انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے بھی تمہیں دریافت تو میں نے ہی کیا تھا' ہے نا؟ تم شامل ہو سکتی ہو لیکن یہ سوچ لو کہ تم تمام وقت مجھے نصیحتوں اور مشوروں سے تو نہیں نوازا کرو گی۔ مجھے اپنی خود مختاری بہت عزیز ہے۔ اس کے علاوہ مجھ پر اس شو کے سلسلے میں بہت سی ذمے داریاں ہیں۔۔۔''

''میں بالکل مداخلت نہیں کروں گی۔'' تانیا نے جلدی سے کہا۔

''اور تم ہمارا خیال رکھو گی؟''

''مجھے موقع تو دو۔۔۔۔''

''ہمارے کپڑوں میں بٹن ٹانکو گی؟''

''ہاں۔۔۔ اور تمہارے موزوں کی مرمت بھی کروں گی۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے پیر نہیں ہیں۔'' ہیرو نے سخت لہجے میں اسے یاد دلایا۔

''میں تم لوگوں کے لیے سوئیٹر بنوں گی۔''

''ہاں۔۔۔۔ یہ ہوئی نا بات۔'' ہیرو نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے سوئیٹر کبھی نہیں پہنے۔ اور ہاں۔۔۔ تمہیں معلوم ہے تمہیں پیسے بھی نہیں ملیں گے۔''

''مجھے پیسوں کی کوئی پروا نہیں۔''

''تب ٹھیک ہے۔ تم ہمارے ساتھ شامل ہو سکتی ہو۔''

''شکریہ ہیرو۔''

''شکریہ تانی۔۔۔ خوش آمدید۔''

تانیا کو یاد نہیں کہ وہ کون سا جذبہ تھا۔ جو اسے اسٹیج کے بہت قریب لے گیا

اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ ہیرو نے اُس کے گلے میں باہیں ڈال دی تھیں۔۔۔اور اپنے چوبی ہاتھ سے اس کا رخسار تھپتھپا رہا تھا۔

''اے تانی۔۔۔رومت۔'' اس نے چیخ کر کہا۔''میں تو شروع ہی سے یہ چاہتا تھا کہ تم ہمارے ساتھ رہو لیکن میں منیجر ہوں مجھے اس کا بھرم بھی تو رکھنا تھا۔ میں تو بس یونہی اداکاری کر رہا تھا۔ میں تمہیں' مفلس خان اور اہلِ خانہ' میں خوش آمدید کہتا ہوں۔''

نیچے سے چالباز کا زبردست قہقہہ سنائی دیا۔۔۔پھر چمپا کی باریک چیختی آواز۔۔۔''آخر اسے ساتھ رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں ہمارا پیٹ تو ٹھیک طرح سے بھرتا نہیں ہے۔''

پھر بواتمیزن اسٹیج پر نمودار ہوئی۔''یاد رکھنا'' اس نے سرگوشی کی۔ ''میں نے پہلے ہی تمہیں تنبیہہ کر دی تھی۔''

پھر رستم ابھرا۔''مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میری دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ حالاں کہ بے وقوف ہونے کی وجہ سے میری دیکھ بھال بہت ضروری ہے' سر میں بھی کھجلی ہوتی ہے۔۔۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا سر تانیا کے سامنے جھکایا۔۔۔

یک لخت ہیرو مستعد ہو گیا۔''نہیں رستم ابھی نہیں۔'' پھر اس نے گولو کو پکارا۔''گولو۔۔۔گولو۔۔۔کہاں ہو تم؟''

''حاضر ہوں چھوٹے باس۔'' گولو چراغ کے جن کی طرح نمودار ہو کر بولا۔''تانیا ہمارے ساتھ رہے گی۔ اس کے لیے گاڑی میں جگہ بناؤ۔'' ہیرو نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''دل خوش کر دیا ہیرو۔'' گولو نے نعرہ لگایا۔''مجھے یقین ہے کہ تانیا ہمارے لیے مبارک ثابت ہو گی۔ میں اس کے لیے جگہ بناتا ہوں۔''

''جلدی کرو۔۔۔پھر واپس آ کر سامان سمیٹو۔''

''ابھی لو چھوٹے باس۔'' گولو چہکا۔''میں ابھی سارے کام نمٹا دیتا ہوں۔مس' آپ میرے ساتھ آئیں۔ میں آپ کو ٹھکانے لگا دوں گا۔'' اس نے تانیا کی باسکٹ تھامی اور اُسے لے کر گاڑی کی طرف چل دیا۔

باسکٹ اس نے وین کے عقبی حصے میں لدے ہوئے سامان کے ساتھ رکھ دی۔ عقبی حصے میں دونوں طرف نشستیں تھیں' جن پر سویا بھی جا سکتا تھا۔ دونوں نشستوں کے درمیان سامان بکھرا ہوا تھا۔ اس میں کٹھ پتلیوں کے ملبوسات پینٹ کے ڈبے' پرانے اخبارات' کچھ برتن' پٹرول کا ایک فاضل ٹن اور نہ جانے کیا الم غلم بھرا ہوا تھا۔ وین میں اس مکان کی سی بے ترتیبی تھی' جو عورت کے دستِ نفاست سے محروم ہو۔

گولو نے سامان کو ترتیب سے رکھنے کی ناکام کوشش شروع کر دی۔'' بظاہر تو یہاں زیادہ جگہ نہیں ہے لیکن۔۔۔''

''کوئی بات نہیں گولو'' تانیا نے اس کی بات کاٹ دی۔''تم فکر نہ کرو۔ میں نے ہیرو سے وعدہ کیا ہے میں ابھی یہ سب کچھ ترتیب سے رکھ دوں گی۔ دیکھ لینا۔۔۔پانچ منٹ بھی نہیں لگیں گے۔''

اور واقعی۔۔۔اس نے بہت تیزی سے کام کیا۔ اتنے دن گھر سے محروم رہنے کے بعد وہ ان کاموں کو ترس گئی تھی۔ اس وین کی صورت میں ایک گھر اسے میسر آ گیا تھا۔ وہ اس کی صفائی میں یوں جتی' جیسے برسوں کی تلاش کے بعد کسی کو گھر کے نام پر ایک کھنڈر ملے۔۔۔اور وہ اسے سچ مچ گھر بنانے پر تُل جائے۔ وہ گنگناتی رہی اور ہر چیز سلیقے سے رکھتی رہی۔ وہ گنگناتی رہی۔۔۔۔زندگی کے گیت۔۔۔اُن گیتوں میں موت کا استرداد تھا۔۔۔موت سے محبت پر پچھتاوے کا اظہار تھا۔۔۔اور زندگی جیسے حسین محبوب کے ملنے پر خدا کے حضور تشکر کا اظہار تھا۔

اُس نے تمام کپڑے تہ کیے' اخباروں کو سلیقے سے ایک طرف رکھا' برتن ایک جانب لگائے اور پینٹ کے ڈبے اور پٹرول کا ٹن نشست کے نیچے رکھ دیا۔ اب وہی وین بے حد کشادہ معلوم ہو رہی تھی۔ دونوں نشستیں صاف کر دی گئی تھیں۔۔۔ اور وہ اپنے مستقبل کے گھر کو دیکھ دیکھ کے خوش ہو رہی تھی۔ اب یہی اس کا گھر تھا' جہاں اسے ہیرو' چالباز' چمپا' رستم' راگی' بواتمیزن اور پروفیسر عقل مند کے ساتھ رہنا تھا۔ وہ اس قدر خوش تھی کہ اسے ایک بار بھی یہ خیال نہ آیا کہ وہاں ان کٹھ پتلیوں کے علاوہ گولو بھی ہوگا۔۔۔ اور وہ شخص بھی جو پس پردہ رہ کر ڈوریاں ہلاتا ہے۔۔۔ جس کے اشارے پر تمام کٹھ پتلیاں ناچتی ہیں۔۔۔ اس کے ساتوں نئے دوست جس کی زبان بولتے ہیں۔

صفائی سے فارغ ہونے کے بعد وہ وین سے اُتر آئی۔ اب اسے گولو کی تلاش تھی۔ لیکن جب گولو اسے نظر آیا تو وہ اسے پکار بھی نہ سکی۔ اس سے بولا بھی نہ گیا۔ وہ منظر اس کے لیے اتنا ہی عجیب تھا۔ کٹھ پتلیوں کا اسٹال پہلو کے بل گرا ہوا تھا۔ گولو نے تمام پردے اتار لیے تھے اور اب نہیں تہ کر رہا تھا۔ اسے کوئی کٹھ پتلی نظر نہ آئی۔ قریب ہی صندوق رکھا ہوا تھا۔ شاید تمام کٹھ پتلیاں اس صندوق میں بھر دی گئی تھیں۔ وہ بانس اب بھی گڑا ہوا تھا' جس پر پیٹرومکس لٹکا ہوا تھا۔ اس بانس سے ٹیک لگائے ایک اجنبی شخص کھڑا تھا۔ وہ نیلی قمیص' نیلی جینز اور کینوس کے سفید جوتوں میں ملبوس تھا۔ سر پر نیلے ہی رنگ کی کیپ تھی۔۔۔ اور ہونٹوں کے درمیان جلتا ہوا سگریٹ جھول رہا تھا۔

لرزتی ہوئی روشنی اور بھڑکتے ہوئے سایوں کی وجہ سے وہ اس کی عمر کا تعین نہیں کرسکتی تھی۔ البتہ اس کے کھڑے ہونے کا انداز اور چہرے کا تاثر بتاتا تھا کہ وہ ہر چیز کا مضحکہ اڑانے والا بے حد سرد مہر آدمی ہے۔ اس کی نظریں تانیا پر جمی ہوئی تھیں۔۔۔ اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

تانیا کے دل کو جیسے کسی سرد سی لہر نے چھولیا۔ اس شخص کے انداز میں گرم جوشی تھی اور نہ ہی وہ کوئی مہربان آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی جینز کی جیبوں میں تھے۔ تانیا کی معصومیت بھی یہ جانے بغیر نہ رہ سکی کہ وہ شخص بے حد خودغرض' بے مہر اور سفاک ہے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس احساس کے باوجود وہ اسے پسند کیے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ وہ شخص کٹھ پتلیوں کا آقا ہے۔۔۔ اُن کٹھ پتلیوں کا' جنہوں نے اُس کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کیا تھا۔۔۔ اور اسے زندگی کی طرف کھینچ لائی تھیں۔۔۔ جنہوں نے اس کو موت کی حقیقی دہشت اور زندگی کے اصل مفہوم سے روشناس کرایا تھا۔ وہ اُن کٹھ پتلیوں سے محبت کرنے لگی تھی۔۔۔ لیکن ان کے آقا کو دیکھ کر وہ خوفزدہ ہوگئی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے خواہش کی کہ کاش' وہ کٹھ پتلیوں کا آقا نہ ہو۔۔۔ بلکہ کوئی اور ہو۔۔۔ کوئی مزدور' کوئی تماشائی۔۔۔ نجومی۔۔۔

گولو نے پردے تہ کر کے صندوق میں رکھے اور سیدھا ہوگیا۔ اُس نے باری باری اُن دونوں کی طرف دیکھا۔ آقا خاموش تھا۔۔۔ اور لڑکی خوفزدہ تھی۔ وہ دونوں یوں اجنبی بنے ہوئے تھے' جیسے ایک دوسرے سے واقف ہی نہ ہوں۔۔۔ جیسے آقا نے پردوں کے پیچھے سے اس لڑکی کو خودکشی کے ارادے سے بڑھتے ہوئے دیکھا ہی نہ ہو۔۔۔ جیسے لڑکی یہ جانتی ہی نہ ہو کہ یہ وہ شخص ہے' جو بے جان کٹھ پتلیوں کو حرکت اور لہجہ دیتا ہے۔۔۔ ان کی زبان ہے۔۔۔ اور پتلیاں اس کے اشارے پر ناچتی ہیں۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے انجان بن رہے تھے۔ دونوں کے پیشِ نظر اپنی اپنی وجوہات تھیں۔۔۔ اسباب تھے۔ سہمی ہوئی لڑکی یہ جاننا نہیں چاہتی تھی کہ اتنی مہربان پتلیوں کا آقا اس قدر نامہربان بھی ہوسکتا ہے۔ آقا۔۔۔ سخت دل آقا' لڑکی کو یہ احساس نہیں دلانا چاہتا تھا کہ درحقیقت اس نے اس کی جان بچائی

ہے۔ چنانچہ گولو کو ان دونوں کا تعارف کرانا پڑا۔'' تانی بے بی' یہ ہیں ہمارے آقا مفلس خان۔ ان کا نام آذر ہے۔'' اس نے کہا اور آقا کی طرف دیکھا جو ساکت و صامت کھڑا تھا۔ پھر وہ آقا سے مخاطب ہوا۔'' آقا۔۔۔ یہ مس تانیا ہیں۔ یہ اندھیرے میں روتی ہوئی' خودکشی کی غرض سے سمندر کی طرف جارہی تھیں کہ ہیرو نے انہیں دیکھ لیا۔ ہیرو نے انہیں روکا اور ان سے بات کی۔ پھر چالباز نے یہ پتا چلایا کہ یہ اچھا گا سکتی ہیں۔ اس کے بعد پروفیسر نے انہیں سمجھایا کہ یہ ہمارے ہی ساتھ رہیں۔ بُو اتمیزن نے انہیں بھڑکانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ ہیرو نے ان کے شو میں شامل ہونے کی درخواست قبول کر لی ہے۔۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہ ہمارے لیے مبارک ثابت ہوئی ہیں۔۔۔ اور آئندہ بھی ہوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے کچھ توقف کیا۔ سب کچھ جاننے کے باوجود اسے یقین تھا کہ تمام پتلیاں آقا کے دست برد میں ہونے کے باوجود اپنے افعال و گفتار میں آزاد اور خود مختار ہیں۔ وہ یہ سب کچھ یوں بیان کر رہا تھا' جیسے آقا ہر بات سے بے خبر ہو۔ اس وقت وہ پتلیوں کا ترجمان تھا۔

تانیا کا تاثر بھی کم و بیش یہی تھا کہ پتلیاں آزاد ہیں۔ وہ انہیں فرد کی حیثیت دیتی تھی۔ لیکن اس وقت وہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے اس شخص سے خوف زدہ تھی' جو پہلی نظر میں اسے اچھا بھی لگا تھا۔ وہ ملے جلے جذبات لیے کھڑی متوقع نگاہوں سے آقا کو تکتی رہی۔ انداز ایسا تھا' جیسے کسی بھی لمحے بھاگ کھڑی ہوگی۔

آقا نے نظریں گھما کر گولو کو دیکھا اور سخت لہجے میں بولا۔'' تو تمہارے خیال میں اس موقع پر مجھے اظہارِ مسرت کے لیے رقص کرنا چاہیے۔ تم وہی کچھ کرو' جو ہیرو نے کہا ہے' سمجھے؟''

'' جی ہاں آقا۔'' گولو سہم گیا۔'' مجھے سامان گاڑی میں رکھنا ہے۔''

'' بس' تو پھر کام کرو۔ اور ہاں' گاڑی تم چلاؤ گے۔ مجھے نیند آرہی

کٹھ پتلیاں

ہے۔''

'' ٹھیک ہے جناب۔'' گولو نے کہا اور صندوق اُٹھا لیا۔ صندوق خاصا بھاری تھا۔ شاید اسی لیے گولو کی رفتار سُست تھی۔

'' جلدی کرو مردود۔'' آقا نے کہا اور گولو کی کمر پر لات رسید کر دی۔

'' ابھی تمہیں اسٹال بھی گاڑی کی چھت پر باندھنا ہے۔ اس رفتار سے تو تم صبح کر دو گے۔''

گولو نے اس لات پر کوئی احتجاج نہ کیا۔۔۔ لیکن تانیا کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اسے اس انسانیت سوز سلوک کی توقع نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ آقا کی نظر میں گولو انسان نہیں' بلکہ کٹھ پتلی ہے۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔۔۔ جب کہ گولو بھی اس توہین کو پی گیا تھا۔
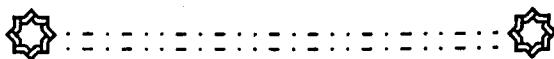
آقا' تانیا کی طرف مڑا اور اس نے پہلی بار تانیا سے خطاب کیا۔ گفتگو کے دوران بھی سگریٹ اس کے ہونٹوں سے لٹک رہا تھا۔۔۔ اور ایک بار بھی لرزتا دکھائی نہ دیا تھا۔۔۔ بلکہ تانیا نے تو اس کے ہونٹوں کو بھی جنبش کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ پیشہ ہی ایسا ہے۔ اس میں آدمی ہونٹ ہلائے بغیر بھی بول سکتا ہے۔

'' ہاں۔۔۔ تو تم تانیا ہو۔ یہاں آؤ میرے قریب۔'' تانیا کسی سحرزدہ معمول کی طرح بلا ارادہ اس کی طرف کھنچی چلی گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کے روبرو تھی اور وہ کسی قصائی کے سے انداز میں اس کا سرتاپا جائزہ لے رہا تھا' جیسے وہ لڑکی نہیں' بلکہ قربانی کا جانور ہو۔

'' گولو سے ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں۔'' اس نے جیسے تانیا کے خیالات پڑھ لیے تھے۔'' اس سے اچھی زندگی اسے کہیں نہیں مل سکتی۔ اور اب تم میری بات ذرا غور سے سنو۔۔۔'' اس نے توقف کیا اور سگریٹ کو ہونٹوں کے

درمیان حرکت دی۔

تانیا کا جسم لرز رہا تھا۔

''اگر تم ڈھنگ سے رہیں تو عمر بھر ہمارے ساتھ رہ سکتی ہو۔'' اس نے بات پوری کی۔ ''لیکن تمہیں ایکٹ کے سلسلے میں بھی کام کرنا ہوگا۔ نہیں کرو گی تو تمہیں لات مار کر نکال باہر کروں گا۔ ہیرو خواہ کچھ بھی کہے۔ ہیرو تمہیں پسند کرتا ہے۔ چالباز اور راگی کا خیال ہے کہ تم گا سکتی ہو۔ مجھے تمہارا بچکانہ چہرہ سخت ناپسند ہے۔ بہرحال۔۔۔۔ اگر آمدنی بڑھتی ہے تو اس کی خاطر میں تمہیں برداشت کر سکتا ہوں۔ بس اب گاڑی کے عقبی حصے میں بیٹھ جاؤ۔ اگر بھوک لگی ہے تو روٹی چٹنی موجود ہے' کھا لینا۔ بس۔۔۔ بولنا مت۔۔۔ اب چل دو۔''

اگر اس وقت تانیا کے پاس اس کی باسکٹ موجود ہوتی تو وہ یقیناً پلٹ کر بھاگ کھڑی ہوتی۔ لیکن اس کی باسکٹ وین میں تھی۔ یہ بات نہیں کہ باسکٹ میں کوئی قیمتی چیز تھی۔ لیکن وہ اس نسوانی جبلت کو کیا کرتی' جس کے تحت عورت کے لیے اپنی حقیر ترین چیز سے دست بردار ہونا بھی ناممکن ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مسئلہ اور بھی تھا' وہ کہاں جاتی؟ اب خود کو سمندر کے سپرد کرنا تو ناممکن تھا کیوں کہ وہ خونخوار مچھلیوں کے بارے میں سُن چکی تھی۔

آنسوؤں نے اس کی بصارت دُھندلا دی تھی۔ تاہم وہ خاموشی سے پلٹی اور وین کی طرف بڑھ گئی۔ وین میں بیٹھ کر وہ آوازیں سنتی رہی' جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ گولو اسٹال کو گاڑی کی چھت پر رکھ کر باندھ رہا تھا۔

آقا وین کی درمیانی نشست پر جا لیٹا۔ اس نے جوتے اتار دیے تھے اور کیپ سر پر کھینچ لی تھی۔ گولو نے وین اسٹارٹ کی۔۔۔ پھر وہ ساحل سے دور ہوتی گئی۔ تانیا عقبی حصے میں نشست پر سہمی سمٹی بیٹھی تھی۔ اس نے ہتھیلی کی پشت سے اپنے آنسو خشک کیے اور چٹنی سے لگا لگا کر روٹی کھانے لگی۔ آقا کی شخصیت اور اس کے

رویّے کے باوجود یہ امر اس کے لیے طمانیت خیز تھا کہ وہ دنیا کے ہنگاموں سے محفوظ تھی۔۔۔ اس کے پاس سر چھپانے کو ٹھکانا بھی تھا اور محبت کرنے والے ساتھی دوست بھی۔

کھانے کے بعد وہ نشست پر دراز ہو گئی۔ وہ دیر تک اپنے نئے دوستوں کے بارے میں سوچتی رہی۔۔۔ اور مسکراتی رہی۔ ہیرو۔۔۔ اس کی منیجری۔۔۔ اس کی پریشانیاں۔۔۔ چالباز' عیار ہونے کے باوجود محبت کے قابل تھا۔۔۔ رستم' جو دوسروں کو ڈرانے کی ناکام کوششیں کرتا تھا۔۔۔ چمپا' جو مغرور اور سرپھری تھی۔۔۔ راگی' جس کی آواز بے حد نرم اور شیریں تھی اور انداز دوستانہ تھا۔۔۔ افواہ ساز بواتمیزن' جو جہاندیدہ تھی اور دوسروں کے لیے خوف زدہ رہتی تھی' انہیں مشورے دیتی تھی۔۔۔ پروفیسر عقل مند' جو بے حد ہمدرد تھا۔۔۔ کھلونے بناتا تھا۔۔۔ جوڑتا تھا' جس پر اعتبار کیا جا سکتا تھا۔ وہ ان سب کے بارے میں سوچتی رہی۔۔۔ مسکراتی رہی۔۔۔ یہاں تک کہ اُسے نیند آ گئی۔۔۔

کٹھ پتلیوں کے آقا کا' جو خود کو مفلس خان کہتا تھا' اصل نام آذر تھا۔ وہ شہر کے تنگ و تاریک گلی کوچوں کی پیداوار تھا۔ اس کی پرورش مصائب کی گود میں ہوئی تھی۔ اس کی زندگی میں نرم دلی' رحم اور محبت کا کوئی خانہ نہیں تھا' کیوں کہ اس نے زندگی کا صرف ایک ہی روپ دیکھا تھا۔۔۔ سختی کا روپ۔۔۔ جس میں بقا کے لیے سخت جدوجہد ضروری ہوتی ہے۔ اس کے لیے زندگی بازار کی اُس بھیڑ کی مانند تھی' جس میں ہر شخص کو آگے بڑھنا ہے جہاں کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ ایسے

میں کوئی کمزور شخص گر جائے تو اسے اٹھانے والا کچل دیا جاتا ہے۔ ایسے میں بقا کی ایک ہی صورت ہوتی ہے۔۔۔ اور وہ یہ کہ گرنے والے کے وجود پر پاؤں رکھ کر آگے نکل لیا جائے۔ اس بھیڑ میں رحم دلی کا مظاہرہ کرنے والے کو صرف موت ملتی ہے۔ آذر نے بچپن ہی میں یہ سب کچھ سمجھ' سیکھ لیا تھا۔

باپ اس کی پیدائش سے پہلے ہی مر گیا تھا۔ چنانچہ اسے کبھی یہ علم نہ ہوسکا کہ باپ کی شفقت اور سائے کا مفہوم کیا ہے۔ اس کی ماں سڑکوں پر محنت مزدوری کرتی تھی۔ چنانچہ آذر کو اوائل عمری ہی میں یہ احساس بھی ہو گیا کہ محنت مزدوری وہی کرتا ہے' جو غریب ہوتا ہے۔۔۔ اور غریب کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ اپنی ماں کے حوالے سے اسے اُن باتوں کا علم وقت سے بہت پہلے ہو گیا۔ جو عموماً صرف بلوغت سے مشروط ہوتی ہیں۔ اس کی عمر چھ سال تھی کہ اس کی ماں کو کسی سڑک چھاپ غنڈے نے قتل کر دیا۔ آذر کو اپنی ماں کا جرم معلوم تھا۔ وہ غربت کے باوجود عزت دار بننے کی کوشش کرتی تھی۔ بالآخر وہ اسی کوشش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ آذر کو احساس تھا کہ اس کی ماں طبعاً معصوم تھی۔ اور اس کے نزدیک معصومیت کو اس دنیا میں صرف ایک انعام مل سکتا تھا۔۔۔ موت! یہی وجہ ہے کہ اسے معصومیت سے نفرت ہو گئی۔

ماں کی موت کے بعد سرکس میں کام کرنے والے ایک لاولد جوڑے نے آذر کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ آذر کا بن مانگا باپ سرکس میں آگ کھانے کا کرتب دکھاتا تھا۔ وہ ہر وقت نشے میں دھت رہتا تھا۔ اسے یہ علم بھی نہیں تھا کہ اسے ایک بیٹا مل گیا ہے' بن مانگی ماں رقاصہ تھی۔۔۔ اور آذر پر جان چھڑکتی تھی۔ وہ آذر کی ہر خواہش۔۔۔ ہر فرمائش پوری کرتی۔ لیکن آذر کو اُس سے نفرت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی اپنی ماں نہایت بے وقوف عورت تھی۔۔۔ لیکن بن مانگی ماں کو دیکھ کر اصل ماں کی بے وقوفی کا احساس بے حد شدید ہو جاتا۔ ان دونوں ماؤں میں بڑا

سفاکانہ تضاد تھا۔ ایک عزت دار بننے کی کوشش میں غیر فطری موت سے ہم کنار ہوئی تھی۔۔۔ دوسرے بے عزتی کے سائے میں پھل پھول رہی تھی۔ سرکس سے جو تنخواہ ملتی تھی' وہ تو شرابی شوہر کی نذر ہو جاتی تھی۔ چنانچہ بن مانگی ماں تماشائیوں کے ساتھ اکثر باہر جاتی رہتی تھی۔ یوں سرکس کی تنخواہ حقیر ہو کر رہ گئی تھی۔ اس عورت نے بہت پہلے سمجھوتے کا مفہوم سمجھ لیا تھا۔۔۔ جان لیا تھا کہ دنیا کمزوروں سے جو کچھ طلب کرتی ہے' لے کر رہتی ہے۔ ہنسی خوشی دے دو تو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ مزاحمت کرو تو کچھ بھی نہیں ملتا۔۔۔ اور جانے والی چیز بہر حال جا کر رہتی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ چار دیواری سے محروم عورت آبرو سے نہیں جی سکتی۔ چنانچہ اس نے سمجھوتا کر لیا تھا۔۔۔ اور خوش تھی۔ فطرت کے اعتبار سے وہ محبت کرنے والی عورت تھی۔ اولاد کی کمی اس نے آذر کی صورت میں پوری کر لی تھی۔ وہ آذر سے دیوانہ وار محبت کرتی تھی۔۔۔ بے غرض محبت۔ اسے اس بات کی پروا بھی نہیں تھی کہ وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔

آذر کا بن مانگا باپ دنیا سے رخصت ہوا تو آذر کی عمر بارہ سال تھی۔ اس روز بن مانگا باپ کرتب دکھانے کے لیے آیا تو نشے میں دُھت تھا۔ اسے اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے اپنے منہ میں کتنا پٹرول بھر لیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ منہ سے شعلے اگلنے کے بجائے شعلے نگلنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی موت بے حد کربناک' اور دیکھنے والوں کے لیے بے حد خوفناک تھی۔ وہ اندر سے جلا تھا۔ آذر وہ منظر کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ صرف بارہ سال کی عمر میں اس نے موت کا اس قدر خوفناک روپ دیکھا تھا کہ اس کے نزدیک زندگی اہم ترین چیز بن گئی تھی۔۔۔ اُس نے سمجھ لیا تھا کہ سب کچھ قربان کر کے صرف جینا مہنگا نہیں بلکہ ارزاں ترین سودا ہے۔ زندگی کے مقابلے میں ہر چیز حقیر ہو کر رہ گئی تھی۔

پھر آذر کو ایک اور جھٹکا لگا۔ اُس نے اپنی بن مانگی ماں کو بدلتے دیکھا۔

وہ عورت جو صرف چند نوٹوں کے لیے دانستہ اپنے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب ہوتی تھی' شوہر کی موت کے بعد گویا بکھر کر رہ گئی۔ اس نے باہر آنا جانا چھوڑ دیا۔ مرد اور عورت کے تعلق کا یہ انوکھا روپ آذر کی سمجھ سے باہر تھا۔ ۲۳ برس بعد اب بھی وہ تعلق اس کے لیے ایک معما تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کوئی کسی کے لیے کیسے مر سکتا ہے۔ لیکن اس نے ایک سال کے عرصے میں اپنی بن مانگی ماں کو نفس نفس مرتے دیکھا۔ وہ قسط وار موت بھی بے حد خوفناک تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس عورت کو اندر ہی اندر کوئی گھن چاٹ رہا ہو۔ بالآخر ایک سال بعد وہ بھی مر گئی' اور آذر ایک بار پھر تنہا رہ گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۳ سال تھی۔

اب وہ تھا اور شہر کی اندھیری گلیاں۔ ایک کمزور لڑکے کی حیثیت سے یہ بہت مشکل تھا۔ لیکن وہ اندھیری گلیاں اس کی تربیت گاہ بن گئیں۔ وہ لڑنے بھڑنے' چاقو چلانے' فراڈ کرنے میں طاق ہو گیا۔ یعنی اس نے جان لیا کہ بدترین حالات میں بھی کیسے زندہ رہا جا سکتا ہے۔ وہ گھر کے مفہوم سے نا آشنا تھا۔ کچھ طبیعت میں بھی آوارگی تھی۔ وہ کبھی ایک جگہ نہیں ٹھہرا۔ بس اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔۔۔ زندگی کو بس گزارتا رہا۔ اب اس کی عمر ۳۵ سال تھی۔

نسوانی نکتہ نظر سے وہ ایک خوبرو مرد تھا۔ گٹھا ہوا بدن' لمبا قد' بھورے بال' بھوری سرد آنکھیں' بیٹھی ہوئی ناک جو ایک لفنگے سے ہونے والی لڑائی کی یادگار تھی۔۔۔ اور چہرے پر زندگی کے موسموں کی چھوڑی ہوئی سختی۔ اُس کے چہرے پر ہمیشہ نفرت اور تلخی کی تحریر ہوتی تھی۔

زندگی میں کسی نے اس پر کبھی کوئی مہربانی نہیں کی تھی۔۔۔ سوائے بن مانگی ماں کے۔۔۔ اور اس سے وہ نفرت کرتا تھا۔ شاید اسی لیے اسے مہربانی سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ دوسری طرف اس کا کہنا تھا کہ اسے جو کچھ دنیا نے دیا ہے' دنیا کو وہی کچھ لوٹائے گا۔ اچھائی' نیکی اور انسانی فطرت کے بھلے پہلو جیسی کسی چیز

وہ یقین نہیں رکھتا تھا' وہ عزت کا بھی قائل نہیں تھا۔ اس کے نزدیک ہر انسان زندگی کے معاملے میں اس کا حریف تھا۔ وہ صرف ان انسانوں سے رابطہ رکھتا تھا' جنہیں استعمال کر سکے۔ اپنی زندگی کے لیے وہ کسی کا گلا بھی گھونٹ سکتا تھا۔ وہ ملکیت کے احساس سے نا آشنا تھا۔ جب تک آدمی کا کوئی گھر نہ ہو' ملکیت کا احساس تعلیم ہوتا بھی نہیں ہے۔ دنیا میں کوئی چیز اس کی اپنی نہیں تھی۔۔۔ سوائے خود اپنے۔ اور یہی چیز سب سے اہم تھی۔ عورت ہو' بچہ ہو یا خدا ہو' اُس کی نگاہوں میں نہ کسی کی اہمیت تھی' نہ عزت۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی سے محبت نہیں کی تھی۔۔۔ اور محبت کے بغیر آدمی احترام کرنا نہیں سیکھ سکتا۔ عورتوں کو وہ اتنی ہی اہمیت دیتا تھا' جتنی روٹی کو۔ بھوک لگے تو روٹی ہر شخص کو عزیز ہوتی ہے۔۔۔ لیکن پیٹ بھرنے کے بعد اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ فاقوں سے نہیں ڈرتا تھا۔۔۔ اور پیٹ بھر کر روٹی کھانے کے بعد روٹی کو بے پروائی سے ایک طرف پھینک دیتا تھا۔

اگر کوئی اس سے پوچھتا' اس نے سوکھی سڑی چرخ تانیا کو مرنے سے کیوں بچایا ہے تو وہ اس بات کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ وہ اصرار کرتا کہ اس معاملے میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ نہ تو اُس نے خودکشی کی نیت سے ساحل کی طرف بڑھنے والی لڑکی کو روکا تھا۔۔۔ اور نہ ہی اسے اپنے اہل خانہ میں شامل ہونے کی ترغیب دی تھی۔ اس کے نزدیک وہ سب کچھ اس کی کٹھ پتلیوں کا کیا دھرا تھا۔ اُن میں ہیرو' چالباز اور پروفیسر عقل مند پیش پیش تھے۔ آخری فیصلہ بہرحال' ہیرو کا تھا۔

بے شک۔۔۔ پردے کے پیچھے بیٹھ کر ڈوریاں وہی ہلاتا تھا۔۔۔ وہ ان پتلیوں کو آواز دیتا تھا۔۔۔ لیکن اس کے نزدیک وہ ساتوں پتلیاں آزاد روح رکھتی تھیں۔ وہ سات افراد تھے۔ ان کی سوچ اور فکر ان کی اپنی تھی۔ وہ تو محض اُن کی ترجمانی کرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اُن پتلیوں پر اس کا کوئی زور نہیں

ہے۔ وہ اپنے قول وفعل میں آزاد ہیں۔ اس نے اس سلسلے میں کبھی زیادہ سوچا بھی نہیں تھا۔ بس اسے اس بات پر یقین تھا کہ وہ تمام پتلیاں اپنی مرضی کی مالک ہیں اور اسے ان کے معاملات میں مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ یقین اس کے لیے بے حد طمانیت بخش تھا۔

یہ پتلیوں کی تخلیق کا سلسلہ بھی عجیب تھا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے وقت وہ وہیں تھا۔۔۔ اور جنگی قیدی بنا کر قیدیوں کے کیمپ میں بھیج دیا گیا تھا۔ اس نے سرکس کے ماحول میں ایک عمر گزاری تھی اور اُسے بے شمار کرتب آتے تھے لیکن کیمپ میں قید کی زندگی کے دوران اُس میں تخلیق کی خواہش پوری شدت سے اُبھر آئی۔ وہ کیمپ اس اعتبار سے اس کے لیے ایک درس گاہ ثابت ہوا کہ وہاں اسے فطرتِ انسانی کے مطالعے کا موقع ملا۔ وہ اظہار کا بھی کبھی قایل نہیں رہا تھا۔۔۔ بلکہ اظہارِ ذات کا تو وہ مفہوم بھی نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن کیمپ کی خشک زندگی میں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے اپنی زندگی کے بارے میں سوچا۔ وہ ایک فرد تھا۔۔۔ ایک اکائی۔۔۔ لیکن اس میں کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ وہ کبھی اپنے آپ کو منوا نہیں سکا تھا۔۔۔ اپنا اثباتِ وجود دوسروں پر ثابت نہیں کر سکا تھا۔ یہی محرومی انسان کو اظہارِ ذات کی ترغیب دیتی ہے۔ لیکن وہ اظہار کو گھٹیا پن سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس کے شعور نے اظہارِ ذات کی خواہش کے خلاف شدید مزاحمت کی۔ یوں وہ خواہش اس کے لاشعور میں محصور ہو گئی۔ یہ شعور اور لاشعور کے درمیان ہونے والی اُس جنگ کا نقطۂ آغاز تھا' جو انسان کے وجود میں ازل سے ہوتی آ رہی ہے۔ شعور سادہ لوح ہوتا ہے اور ہر شے کو اُس کے اصل روپ اور مفہوم میں سمجھتا' قبول کرتا اور باور کراتا ہے۔ اس کے برعکس لاشعور ایک عیار بہروپیا ہے' جو چیزوں کی ماہیئت اور مفہوم بدل کر انہیں شعور کے لیے قابلِ قبول بنا دیتا ہے۔

یہاں بھی یہی ہوا۔ آذر کے لاشعور نے شعور کی مزاحمت کا اندازہ کر لیا

تھا۔ چنانچہ اس نے چھپ کر وار کیا۔۔۔ اظہارِ ذات کی خواہش کو خود کو منوانے کی خواہش کے میک اَپ میں شعور کے سامنے پیش کر دیا۔ ایک دن آذر کیمپ کمانڈر کے سامنے پیش ہوا اور اسے بتایا کہ وہ تفریح کو ترسے ہوئے قیدیوں کے لیے تفریح کا سامان کرنا چاہتا ہے۔ کیمپ کمانڈر نے اس کی بات بڑی توجہ سے سنی۔ وہ اپنی ڈیوٹی سے اور قیدیوں سے بری طرح عاجز تھا۔ سخت پہرے کے باوجود وہ لوگ آئے دن فرار ہونے کی کوششیں کرتے رہتے تھے۔ وہ ان کی جی داری سے تنگ آ چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید تفریح کی وجہ سے قیدیوں کی شرارتوں میں کچھ کمی ہو جائے۔ چنانچہ اس نے آذر کی تجویز مان لی اور اسے سہولتیں فراہم کرنے کا وعدہ کر لیا۔

اگلے روز آذر نے کام شروع کر دیا۔ اُس نے پہلا پتلا تخلیق کیا۔ پھر اس پر رنگ و روغن کیا۔ یوں بھورے بالوں' بھوری آنکھوں والا ہیرو سامنے آیا۔ اس کے بعد اس نے چھ مزید کٹھ پتلیاں تخلیق کیں۔ آواز پر تو اسے پہلے ہی بے پناہ قابو تھا۔ کام مکمل ہونے کے بعد اس نے اپنے قیدی ساتھیوں کے لیے کٹھ پتلیوں کے تماشے کا اہتمام کیا۔ کیمپ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے ساتھی بے حد خوش تھے۔

اسے اندازہ بھی نہ ہوا کہ ساتوں پتلیاں اس کی اپنی رنگا رنگ اور متنوع فطرت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کر رہی ہیں۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ وہ اظہارِ ذات کے مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔ اسے بس اتنا پتا چلا کہ اس کی تخلیق کردہ پتلیاں خود مختار ہو گئی ہیں۔ ڈوری اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔۔۔ لیکن اس کی انگلیاں ان کی مرضی کے مطابق حرکت کرتی ہیں۔ آواز اس کی ہوتی ہے۔۔۔ لیکن سوچیں اُن پتلیوں کی ہوتی ہیں۔۔۔ اور لفظ جیسے آسمان سے اُترتے ہیں۔ وہ کٹھ پتلیوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن گیا تھا۔ پردے کے پیچھے بیٹھے ہوئے اسے اکثر احساس ہوتا کہ وہ نہیں ہے بلکہ وہ ساتوں ہیں۔ تماشے کے دوران اس کا اپنا وجود عدم ہو کر

رہ جاتا تھا۔

گولو بھی اسے کیمپ ہی میں ملا تھا۔ گولو کو پتلی تماشے نے اپنی طرف کھینچا تھا۔ گولو کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔۔۔ نہ قیدی، نہ پہرے دار۔ بعض اوقات اسے بھوکا ہی سونا پڑتا تھا۔ آذر کو پتلی تماشے کے لیے ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ اس نے کمانڈر سے اجازت لے کر گولو کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اُس دن سے گولو اُس کے ساتھ تھا۔ آذر کے لیے اس کی حیثیت ایک کار آمد شے کی تھی۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گولو کا اس کے سوا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور وہ اُسے چھوڑ کر کبھی نہیں جائے گا۔ اسی لیے وہ اکثر اس کے ساتھ زیادتی کر گزرتا تھا۔ جب بھی اس کا موڈ خراب ہوتا، نزلہ گولو ہی پر گرتا۔۔۔ اور گولو نے کبھی اُف بھی نہیں کی تھی۔ اس اعتبار سے آذر اپنی چھوٹی سی دنیا کا بادشاہ تھا۔۔۔ آقا۔

آذر کے لیے یہ تماشا ایک طرح کا جادو تھا۔ اس کی روح کسی نامعلوم پروسس کے تحت اس کے جسم سے نکل کر کٹھ پتلیوں میں حلول کر جاتی تھی لیکن وہ خدا کے فلسفۂ تخلیق سے مطلق بے خبر تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کوئی انسان بھی دنیا میں پوری طرح بُرا ہو کر۔۔۔ شیطان کا چیلا بن کر زندگی نہیں گزار سکتا۔۔۔ اس میں چھپی ہوئی، دبی ہوئی اچھائی بھی کبھی کبھی اُبھر آتی ہے۔ تاہم وہ بعض اوقات کٹھ پتلیوں کی باتیں سُن کر حیران رہ جاتا۔ اُن کے ردِعمل اس کے لیے تحیر خیز ثابت ہوتے۔ وہ انہیں اپنی مخلوق سمجھتا۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کی اپنی فطرت کے مظاہر ہیں۔۔۔ قیدِ وجود سے وقتی فرار کا ذریعہ ہیں۔ ہیرو، چالباز اور چمپا اگر اس کا ظاہر تھے تو باقی چاروں اس کے باطن کا عکس تھے۔ راگی اس میں چھپے ہوئے فنکار کی نمائندگی کرتا تھا، جسے موسیقی سے پیار تھا۔ رستم اس روح کی علامت تھا، جو دوستی اور پیار کو ترستی تھی۔ جسے زندگی کی سختیوں نے کچل کر رکھ دیا تھا۔ بوا تمیزن اس کی فطرت کے اس پہلو کی عکاسی کرتی تھی، جس کے تحت وہ کسی پر اعتبار نہیں کر سکتا

تھا کیوں کہ اس کی جہاندیدہ آنکھوں نے دنیا کو ہمیشہ۔۔۔ ناقابلِ اعتبار دیکھا تھا۔ پروفیسر عقل مند اُس کے اندر چھپے ہوئے اس فلسفی کا استعارہ تھا، جس نے تعلیم کی کمی کو مطالعے سے پورا کرنے کی کوشش کی تھی، جو طبعاً ہمدرد تھا لیکن دنیا کی سفاکی کے پیشِ نظر اُس نے خود اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

شملہ معاہدے کے بعد وہ وطن واپس آیا تو پتلی تماشا اس کی عادت بن چکا تھا۔ دوسری طرف قیدِ مسلسل کی وجہ سے نگر نگر گھومنے کی خواہش پوری شدت سے اُبھر آئی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک پھٹیچر وین خریدی، اسٹال بنوایا اور کٹھ پتلیوں کے ذریعے روزی کمانے لگا۔ گولو جیسا بندۂ بے دام اسے پہلے ہی میسر تھا۔ تماشے کے ٹھکانے بدلتے رہتے تھے۔ آذر وین کے درمیانی حصے میں موجود نشست پر سوتا تھا جب کہ گولو کسی بھی فٹ پاتھ پر یا پارک میں پڑا رہتا تھا۔ وین کا عقبی حصہ خالی ہونے کے باوجود آذر نے گولو کو کبھی وین میں سونے کی اجازت نہیں دی تھی۔ گولو کو اس کی خواہش بھی نہیں تھی۔

گزشتہ رات جہاندیدہ اور تجربے کار آذر نے تانیا کو ساحل کی طرف بڑھتے دیکھا تو پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا کہ وہ خودکشی کی غرض سے نکلی ہے۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا کہ کوئی اور بات ہو سکتی ہے۔ لڑکی کے ہاتھ میں موجود باسکٹ اور اس کے ڈھلکے ہوئے کندھوں نے پوری کہانی سنا دی تھی۔ لیکن آذر کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ موت کوئی غیر معمولی چیز تو ہوتی نہیں کہ اس کی پروا کی جائے۔۔۔ خواہ خودکشی کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔ لیکن وہ ہیرو تھا، جس نے مداخلت کر کے لڑکی کی جان بچائی تھی۔ ورنہ آذر کو کسی معصوم اور بے سہارا لڑکی کے جینے مرنے سے غرض نہیں تھی۔ محض دلچسپی اور تجسس کی وجہ سے اس نے کٹھ پتلیوں کے کام میں مداخلت کی کوشش بھی نہیں کی۔ یوں اُس کے گھرانے میں ایک فرد کا اضافہ ہو گیا۔

اس نے لڑکی پر کٹھ پتلیوں کا جادو چلتے دیکھا۔ لڑکی مسحور ہو کر رہ گئی تھی۔۔۔۔ خود کو بھی بھول گئی تھی' اس لڑکی میں کوئی غیر معمولی بات تھی۔ وہ اعتبار کرنا جانتی تھی۔ وہ کٹھ پتلیوں سے یوں باتیں کر رہی تھی، جیسے ان کے وجود پر یقین رکھتی ہو۔ آذر کی تجربے کار نگاہوں نے اس لڑکی کی اہمیت بھانپ لی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی۔۔۔ کچھ بھی تھی' تماشے اور تماشائی کے درمیان ایک پُل کا کام کر سکتی تھی۔ وہ ایک ایسا رابطہ ثابت ہو سکتی تھی جو تماشے اور تماشائی کو ہم آہنگ کر سکتا ہے۔ اس کی کٹھ پتلیوں سے گفتگو اتنی بے ساختہ اور فطری تھی کہ اس نے تماشائیوں کے دل چھو لیے تھے۔ حالاں کہ تماشائیوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ اس کی وجہ صرف اور صرف اس کا یقین تھا کہ وہ کٹھ پتلیاں نہیں بلکہ جیتے جاگتے انسان ہیں۔ گزشتہ رات وہ تماشائیوں کے تاثرات بھی بغور دیکھتا رہا تھا۔ معمولی سی تربیت کے بعد وہ مفلس خان اور اہلِ خانہ کے لیے ایک اچھا اثاثہ ثابت ہوتی۔ وہ اسٹیج کے قریب کھڑی ہو کر پتلیوں اور تماشائیوں کے درمیان رابطے کا کام کرتی۔ اس طرح آمدنی میں یقینی اضافے کا امکان تھا۔ آمدنی کی اہمیت اس لیے اور زیادہ تھی کہ مفلس خان اور اہل خانہ کے اخراجات سے کہیں زیادہ اُن کی وین کے اخراجات تھے۔ آذر نے سوچا کہ لڑکی بوجھ ثابت ہونے لگی تو اسے کسی بھی وقت لات مار کر نکالا جا سکتا ہے۔

لیکن تانیا میں ایک خصوصیت اور تھی جو آذر کے لیے بہت زیادہ پُرکشش ثابت ہوئی تھی۔ اس خصوصیت کو دیکھ کر اسے لڑکی سے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔۔۔ اس کے اپنے وجود میں نفرت کا کبھی نہ ختم ہونے والا ذخیرہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نفرت اس کے لیے بے حد آسان تھی۔ وہ خصوصیت تھی تانیا کی معصومیت اور اُس کا خالص پن۔ آذر معصومیت کا دشمن تھا۔ عورت ہو' بچہ ہو یا مرد۔۔۔ وہ معصومیت کو کسی بھی روپ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ پوری دنیا کو غلاظت اور آلودگی میں نہلا کر رکھ دیتا۔ چنانچہ تانیا کی معصومیت اس کے لیے

ایک چیلنج تھی۔۔۔۔ ایسا چیلنج' جسے وہ قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

کار کے عقبی حصے میں تانیا بے سدھ ہو کر سوئی۔ وہ ذہنی طور پر اس قدر تھکی ہوئی تھی کہ آنکھیں بند کرنے کے بعد اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ وہ جاگی تو صبح ہو چکی تھی۔۔۔۔ اور وین کے عقبی حصے میں وہ تنہا تھی۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ سرکس میں کسی ساتھی لڑکی کے ساتھ نہیں سوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے رات کے واقعات یاد آ گئے۔ سارا سکون واطمینان رخصت ہو گیا۔ اور مایوسی اور ناکامی کا احساس لوٹ آیا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور گردوپیش کا جائزہ لینے لگی۔ وین کے شیشے سے دھوپ اندر اُتر آئی تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی باہر دیکھتی رہی۔ بالآخر اس کا خوف قدرے کم ہو گیا۔ شیشے سے جھانکنے پر اسے جگہ کا تو پتا نہ چل سکا۔۔۔ لیکن اتنا اندازہ۔۔۔ بہرحال ہو گیا کہ گاڑی کسی میلے میں کھڑی ہے۔

وہ گاڑی سے اُتر آئی۔ اس نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ وہ ایک بے حد وسیع و عریض احاطہ تھا۔ احاطے میں میدان تھا' ایک حصے میں گھاس اُگی ہوئی تھی اور پھولوں کے کچھ پودے بھی تھے۔ مالی پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ وہ بدستور متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ اس وقت وہ ایک ایسے اہم مسئلے کے بارے میں سوچ رہی تھی' جس سے اس کا پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ کم از کم وہ مسئلہ اس سے پہلے اُس کے لیے مسئلہ کبھی نہیں بنا تھا۔ اسے خود پر شرم آنے لگی لیکن اتنے اہم مسئلے کو وہ نظرانداز بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بظاہر کوئی حل بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

پھر اس نے آذر کو ایک طرف سے آتے دیکھا۔ آذر نے اسے دیکھ لیا تھا لیکن انجان بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ عام حالات میں تانیا کی خودداری اس تغافل کے بعد اس سے بات کرنے کی اجازت ہرگز نہ دیتی۔ لیکن اس وقت اس کی خودداری بھی دب گئی۔ وہ آذر کی طرف بڑھی۔ اس نے اسے سلام کیا۔ وہ بے رُخی سے جواب دے کر آگے بڑھنے لگا۔

''سنیے۔۔۔'' تانیا نے اسے پکارا۔

اس نے پلٹ کر سخت نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں پوچھا۔

''وہ۔۔۔ میں۔۔۔ دراصل۔۔۔ میں۔۔۔'' وہ ہکلا کر رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا کہے۔

''کیا بک رہی ہو۔'' آذر جھنجلا گیا۔

''میں۔۔۔ وہ۔۔۔ دیکھیں نا۔۔۔ صبح ہو گئی ہے۔۔۔'' اس بار بھی وہ اپنا مافی الضمیر واضح نہ کر سکی۔

آذر نے اسے بغور دیکھا۔۔۔ اور وحشیانہ انداز میں ہنسنے لگا۔

''اوہ۔۔۔ میں سمجھ گیا۔'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے پاس ٹھکانا کوئی ہے نہیں۔۔۔ اور انداز شہزادیوں کے سے ہیں۔ سنو احمق لڑکی۔۔۔ اس طرزِ زندگی میں لیٹر بن جیسی عیاشی ممکن نہیں۔''

توہین کے احساس سے تانیا کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔ ''پھر میں کیا کروں؟''

''صبح جلدی اُٹھنے کی عادت ڈالو۔'' آذر کا لہجہ اب بھی زہریلا تھا۔

''یہ میدان بہت بڑا ہے۔۔۔ اور صبح کے وقت یہاں کوئی نہیں ہوتا۔'' اب تانیا کے لیے آنسو ضبط کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

آذر چند لمحے اُسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ''اس شہر میں ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں' جو بے گھر ہیں۔ وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ میں بھی اُن میں شامل ہوں۔''

تانیا بدستور روتی رہی۔ آذر چند لمحے کھڑا سوچتا رہا۔ پھر چلا گیا۔ تانیا روتی رہی۔ پھر ایک مہربان آواز نے اُسے چونکا دیا۔ ''کیا بات ہے بے بی؟''

تانیا نے اپنی ہتھیلی کی پشت سے آنسو پونچھے اور نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ گولو تھا۔ وہ خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی۔

''کیا بات ہے بے بی؟'' گولو نے پھر پوچھا۔

''وہ۔۔۔ وہ بالکل جانور ہے۔۔۔ جنگلی ہے۔'' تانیا نے کہا اور دوبارہ رونے لگی۔

گولو چند لمحے اسے ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتا رہا' پھر بولا۔ ''میں سمجھ گیا۔ آؤ میرے ساتھ۔''

تانیا نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ وہ اسے میدان سے باہر لے آیا۔ ایک طرف چھوٹے چھوٹے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ گولو نے ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نے دروازہ کھولا۔ ''کیا بات ہے گولو؟'' اس نے بے حد پُرتپاک لہجے میں پوچھا۔ شاید وہ اسے بہت اچھی طرح جانتی تھی۔

''یہ بے بی بھی اب ہمارے ساتھ کام کرتی ہے تاجو۔ تو اسے اندر لے جا۔۔۔ اور اسے پوچھ لے۔'' گولو نے کہا اور پھر تانیا سے مخاطب ہوا۔ ''میں جا رہا ہوں۔ تم بعد میں آ جانا۔'' یہ کہہ کر وہ واپس ہو گیا۔ عورت تانیا کا ہاتھ تھام کر اسے اندر لے گئی۔

وہ بہت اچھی طبیعت کی تھی لیکن اس کی فطرت میں تجسس بہت زیادہ تھا۔ وہ تانیا سے کُرید کُرید کو اُس کے بارے میں پوچھتی رہی۔۔۔ وہ کون ہے۔۔۔ پتلی تماشے والے کے ہتھے کیسے چڑھ گئی۔۔۔ تانیا کو یہ بات بالکل اچھی نہیں لگی۔ وہ گول مول جواب دیتی رہی۔۔۔ تاہم اس کا مسئلہ حل ہو گیا۔

''اس پتلی والے سے ہوشیار رہنا۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔۔۔ اور تم مجھے بہت معصوم لگتی ہو۔'' عورت نے اسے سمجھایا۔ تانیا کو یہ بات بھی بُری لگی تاہم اس نے عورت کا شکریہ ادا کیا۔۔۔ اور باہر آ گئی۔ وہ احاطے میں داخل

ہوئی۔۔۔۔ اور مالی کی طرف بڑھ گئی۔ مالی نے ایک نظر اُسے دیکھا۔۔۔ اور خاموشی سے پائپ اس کی طرف بڑھا دیا۔ تانیا نے کُلّی کر کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپکے مارے۔ پہلی بار اُسے طمانیت کا احساس ہوا۔ وہاں سے وہ وین کی طرف بڑھی۔ پتلی تماشے کا اسٹال وین کی چھت سے اُتار کر ایک طرف کھڑا کر دیا گیا تھا۔۔۔ لیکن تانیا کو وہاں نہ آذر نظر آیا' نہ گولو دکھائی دیا۔ وہ وین کی طرف بڑھ رہی تھی کہ عقب سے جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ ''صبح بخیر تانیا۔ کیسی ہو؟''

اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ اسٹال کے اسٹیج پر چالباز موجود تھا۔ چالباز نے اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر لوفرانہ انداز میں سیٹی بجائی اور بولا۔ ''ہیلو' بے بی! منہ دھو کر آئی ہو۔''

''ہاں' میں نے تو منہ دھو لیا ہے تم اپنی سناؤ۔'' تانیا نے اُس پر چوٹ کی۔ اُسے دیکھتے ہی اس کے مزاج کی شگفتگی بیدار ہو گئی تھی۔

''نہیں' میں نے منہ نہیں دھویا ہے لیکن یہ بات کسی کو بتانا نہیں۔'' چالباز نے جلدی سے کہا۔ ''اور دیکھ لینا' کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ میرا منہ ہی ایسا ہے۔'' اس کا لہجہ فخریہ ہو گیا۔ چند لمحے بعد اس نے غوطہ لگایا اور چند لمحوں کے لیے غائب ہو گیا۔

وہ دوبارہ نمودار ہوا تو اس کے ہاتھ میں پانچ کا ایک نوٹ تھا۔ اس نے نوٹ تانیا کی طرف بڑھایا۔ ''یہ ناشتے کے لیے ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر غوطہ لگا گیا۔

اس بار ہیرو اسٹیج پر نمودار ہوا۔ ''صبح۔ بخیر تانیا۔'' اس نے کہا۔ ''نیند تو ٹھیک آئی تمہیں؟''

''ہاں' ہیرو۔ میں خوب سوئی۔'' تانیا نے جواب دیا۔ طمانیت کا احساس اور گہرا ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر دوستوں کے درمیان تھی۔ ان کے پاس کھڑے ہونا۔۔۔ ان سے باتیں کرنا کتنا اچھا لگتا تھا۔

''اچھا۔۔۔ اب تم جا کر ناشتا کرو۔ احاطے کے باہر حلوہ پوری کا ٹھیلا موجود ہے' قریب ہی چائے والا بھی ہے' جلدی کرو' مجھے شو کی تیاری کے سلسلے میں بہت کام کرنا ہے اور ہاں۔۔۔ جو پیسے بچیں' وہ ایمان داری سے واپس لا دینا۔''

''تم فکر نہ کرو ہیرو۔'' تانیا نے کہا اور جانے کے لیے پلٹی۔

''شش۔۔۔ شش۔'' عقب سے کسی نے پکارا۔ تانیا نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ چالباز تھا اور اشارے سے اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ تانیا اس کے قریب چلی گئی۔ چالباز نے اسے کان قریب لانے کا اشارہ کیا۔ تانیا اپنا کان اس کے منہ کے قریب لے گئی تو اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''پیسے واپس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔''

چالباز کے ہونٹوں پر ایک عیار مسکراہٹ لرزی اور آنکھیں چمکنے لگیں۔

''ہش۔۔۔ اتنے زور سے مت بولو۔'' اس نے پھر سرگوشی کی۔ ''بات یہ ہے کہ ہر چیز مہنگی ہو گئی ہے۔ تم کہہ سکتی ہو کہ ناشتے میں پورے پیسے خرچ ہو گئے۔ اس طرح پیسے واپس کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہو گی۔''

''لیکن چالباز' میں اتنی پیٹو تو نہیں ہوں۔'' تانیا نے احتجاج کیا۔

''میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ تم پورے پانچ روپے کھا جاؤ۔ میں تو تمہیں پیسے بچانے کی ترکیب بتا رہا ہوں۔ ایمانداری سے آدھے پیسے مجھے دے دینا' اسکیم تو میری ہی ہے نا۔''

تانیا نے بڑی شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کا تاثر تھا۔ ''نہیں چالباز۔۔۔۔ میں ایسا نہیں کر سکتی' میں بد دیانت نہیں ہوں۔'' اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

چالباز نے مضحکہ خیز انداز میں قہقہہ لگایا۔ ''یہاں سے تمہیں کچھ نہیں ملے

گا۔ یہی ایک صورت ہے آقا سے پیسے نکلوانے کی۔ میں تمہیں بتائے دے رہا ہوں۔ یوں تم عمر بھر کام کرو گی' تب بھی کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔''

''چھی چھی۔۔۔۔ چالباز' مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔'' تانیا نے کہا اور پلٹ گئی۔ وہ ناشتا کر کے واپس آئی تو اسٹیج پر ہیرو اور چمپا موجود تھے۔ شاید ریہرسل ہو رہی تھی۔ چمپا اپنے بالوں میں کنگھا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن سر اور کنگھے والے ہاتھ کے زاویوں کے درمیان رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے دشواری ہو رہی تھی۔ پھر ہیرو نے کنگھا سنبھالا۔۔۔۔ لیکن بات اب بھی بنتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ کچھ لوگ کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

اچانک ہیرو کی نظر تانیا پر پڑی۔ ''اوہ۔۔۔تم واپس آ گئیں؟ ناشتا کر لیا تم نے؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں' ہیرو شکریہ اور یہ پیسے بچے ہیں۔'' یہ کہہ کر تانیا نے بچے ہوئے تین روپے اس کی طرف بڑھا دیے۔

ہیرو نے خالی الذہنی کی سی کیفیت میں اثبات میں سر ہلایا اور روپے لے لیے۔ ''بہت سستا ناشتا کیا ہے تم نے۔'' اس نے تبصرہ کیا اور روپوں سمیت غوطہ لگا گیا۔ چند لمحوں بعد وہ دوبارہ اُبھر آیا اور بولا۔ ''میں کب سے چمپا کے بالوں میں کنگھا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس کے سر میں جوئیں بھی بہت ہو گئی ہیں۔''

''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' چمپا نے پُر زور احتجاج کیا۔ ''میرے سر میں جُوئیں کیسے ہو سکتی ہیں؟''

''ممکن ہے' میں غلط کہہ رہا ہوں۔'' ہیرو نے بڑی سادگی سے اعتراف کیا۔ ''ہو سکتا ہے' میں بھینسوں کو جوئیں سمجھ بیٹھا ہوں۔''

''یہ ہمیشہ یوں ہی بکواس کرتا ہے۔ میں اسے لفٹ جو نہیں دیتی۔''

''اس کے باوجود میں تمہاری زلفیں سنوارنے میں لگا ہوا ہوں۔''

کٹھ پتلیاں

''خاک زلفیں سنوار رہے ہو۔ میرا سر دُکھا کر رکھ دیا تم نے۔'' چمپا روہانسی ہو گئی۔

''اب میں کیا کروں۔ تمہارے بال ہی ایسے ہیں' جیسے ابابیل کا گھونسلا۔'' ہیرو نے ترکی بہ ترکی کہا۔

''اچھا۔۔۔۔اب تم لوگ لڑو مت۔'' تانیا نے انہیں سمجھایا پھر وہ ہیرو سے مخاطب ہو گئی۔ ''یہ کام مَردوں کے بس کا نہیں ہوتا۔ لاؤ کنگھا۔۔۔ میں چمپا کے بال سنواروں گی۔''

''یہ غلط ہے کہ یہ کام مَردوں کے بس کا نہیں۔ ازل سے مَرد ہی زلفِ پریشاں کو سنوارتا آیا ہے۔'' ہیرو نے احتجاج کیا۔

''کاغذ پر ہی سنوارتے ہو گے۔'' چمپا نے چڑ کر کہا۔ ''اتنی دیر ہو گئی۔۔۔ اور تم نے میرا سر دُکھانے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ بال تو ویسے ہی اُلجھے ہوئے ہیں۔''

''میں زلفِ پریشاں کو سنوارنے کی بات کر رہا تھا' ابابیل کے گھونسلے کی نہیں۔'' ہیرو نے بے حد باوقار انداز میں کہا۔

''بکواس مت کرو۔ میں تمہاری شاعری سے بھی عاجز ہوں۔ کام بالکل نہیں کر سکتے۔ بس' شاعری کروا لو تم سے۔ ہنہہ۔۔۔ زلفِ پریشاں سنواریں گے نکمے کہیں کے۔''

ہیرو جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ تانیا نے اس کے ہاتھ سے کنگھا لے لیا اور بولی۔ ''اچھا بس۔۔۔ اب تم چمپا کے بالوں کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔''

''اس کے بالوں کی تو مجھے فکر ہے ہی نہیں۔ میں تو بے چاری جوؤں کے لیے پریشان ہوں۔''

''کیوں۔۔۔کیا پریشانی ہے تمہیں؟'' چمپا چیخ کر بولی۔

''بھوکی مر رہی ہوں گی بے چاریاں۔''

''مطلب کیا ہے تمہارا؟'' چمپا کا لہجہ بے حد خراب تھا۔

''ان کی غذا مغز ہوتا ہے۔۔۔اور وہ ہے ہی نہیں تمہارے پاس۔ تمہارا یہ خوب صورت سر بالکل خالی ہے۔'' ہیرو نے جواب دیا اور چمپا کا ہاتھ حرکت میں آنے سے پہلے ہی غوطہ لگا گیا۔ چمپا دیر تک زیرِلب اُسے بُرا بھلا کہتی رہی۔ تانیا بڑی نرمی سے اُس کے الجھے ہوئے بال سلجھاتی رہی۔

''بال اوپر کر کے باندھنا۔ میں بالوں کے آنکھوں میں آنے سے عاجز آ چکی ہوں۔'' چمپا نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''تم فکر نہ کرو چمپا۔ میں پونی ٹیل باندھوں گی۔ پھر تم دیکھنا۔۔۔تم کتنی اچھی لگتی ہو۔'' تانیا نے بے حد پیار سے کہا۔

چمپا نے پہلی بار اُسے ممنونیت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ ''تمہارے بارے میں میرا پہلا تاثر اچھا نہیں تھا لیکن تم ٹھیک ٹھاک لڑکی ہو۔'' اس نے تبصرہ کیا۔

تانیا بڑے انہماک سے اس کے سنہرے بالوں میں الجھی رہی۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہاں کچھ تماشائی بھی موجود ہیں۔ اس کے نزدیک وہ کوئی ایکٹ نہیں تھا۔ وہ تو جیسے اپنی ایک نخریلی سہیلی کو خوش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چمپا کے بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے وہ ہارسنگھار کا ایک مشہور گیت بھی گنگنا رہی تھی۔ اس کی ماں اس کے بال بناتے وقت ہمیشہ وہی گیت گنگناتی تھی۔ اس گیت میں بلا کی کشش اور سحر تھا۔۔۔بے حد مترنم گیت تھا وہ۔ اس پر تانیا کی بے ساختگی اور انہماک۔ اس ایکٹ نے لوگوں کے دل چھو لیے۔ شاید اس لیے کہ وہ ایکٹ نہیں تھا۔ اسی وقت گولو نمودار ہوا۔۔۔اور اس نے ماؤتھ آرگن ہونٹوں سے لگا لیا۔ اگلے ہی لمحے راگی نمودار ہوا۔۔۔اور تانیا کے ساتھ آواز ملانے لگا۔ پھر چالباز

کے آنے کے بعد تو گویا سماں بندھ گیا۔ چمپا تال دے رہی تھی۔ یہ آواز دور دور تک گئی۔۔۔اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ ہر شخص سحرزدہ دکھائی دے رہا تھا۔ گانا ختم ہوتے ہوتے تانیا چمپا کے بال باندھ چکی تھی۔ چمپا' راگی اور چالباز نے تماشائیوں کی تالیوں کے جواب میں جھک جھک کر آداب کیا تو تانیا اس سحر سے نکلی۔ اس نے حیرت سے مجمع کو دیکھا۔ لیکن اسے ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہ آیا کہ وہ بھی تماشائیوں کی داد کا جواب دے۔ وہ حیران سی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتی رہی۔ گولو کاسہ لے کر تماشائیوں کے درمیان گھوم رہا تھا۔ لوگ کاسے میں سکے اور نوٹ ڈال رہے تھے۔ تانیا اسٹیج کی طرف پلٹی۔۔۔۔ لیکن تمام پتلیاں رخصت ہو چکی تھیں۔

کچھ دیر بعد جب سب تماشائی رخصت ہو گئے تو ہیرو اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس نے تانیا کے سامنے اپنے نئے کھیل کا پلاٹ پیش کیا۔ ''میں ہیرو ہوں۔'' اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''میں چمپا سے محبت کرتا ہوں لیکن چمپا کی ماں بہت لالچی عورت ہے۔۔۔اور چمپا پوری طرح اس کے اختیار میں ہے۔ چمپا کی ماں کا کردار بواتمیزن کرے گی۔ بواتمیزن نے دولت مند راگی کو چمپا کے لیے پسند کر لیا ہے' جو بوڑھا ہے۔ میرا دوست چالباز' چمپا کو اغوا کرانے کے لیے رستم کی خدمات حاصل کرتا ہے لیکن چالباز پہلے ہی سے بوڑھے راگی کا آلہ کار ہے۔ وہ سازش کرتا ہے' جس کے نتیجے میں رستم چمپا کے بجائے اُس کی ماں کو اٹھا لاتا ہے۔ چالباز اسی پر بس نہیں کرتا۔ وہ راگی کو بھی دھوکا دیتا ہے۔۔۔اور خود چمپا کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔۔۔''

اس ڈرامے میں تانیا کو مختلف اور متعدد کردار ملے' اُن میں صرف ایک قدر مشترک تھی۔ وہ تمام پتلیوں کی مشیر اور محرم راز تھی۔ اس کا سب سے اہم کام یہ تھا کہ وہ تمام پتلیوں کے رازوں سے تماشائیوں کو آگاہ کرتی۔۔۔ وہ تماشے اور

تماشائیوں کے درمیان رابطے کے حیثیت رکھتی تھی۔

ریہرسل کے دوران تانیا کی ایک اور صلاحیت سامنے آئی۔ برجستگی اور بے ساختگی کے علاوہ وہ بلا کی حاضر جواب بھی تھی۔۔۔۔اور بعض اوقات ایک سچویشن کو اس طرح موڑ دیتی تھی کہ اس میں سے کئی دلچسپ سچویشنز نکل آتی تھیں۔ یہ بات تو پہلے ہی سامنے آ چکی تھی کہ وہ تماشے کے دوران گردوپیش کو۔۔۔ بلکہ خود کو بھی بھول جاتی ہے۔۔۔تماشے کا ایک جزو بن جاتی ہے۔اس کا سبب یہ تھا کہ وہ ان کٹھ پتلیوں کو محض کٹھ پتلیاں نہیں بلکہ جیتے جاگتے انسان سمجھتی تھی۔اس کے ذریعے غیر محسوس طریقے سے وہ یقین تماشائیوں کو بھی منتقل ہو جاتا تھا۔کسی بھی ڈرامے کی کامیابی کے لیے یہ بات بہت اہم ہوتی ہے کہ تماشائی اسے ڈرامے کے بجائے حقیقت سمجھے۔۔۔ بلکہ خود کو اس میں شامل بھی سمجھے۔تانیا میں یہ غیر معمولی خوبی موجود تھی۔ وہ اپنے یقین کے زور پر ہر تماشائی کو تماشے میں شامل کر لینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

اُس رات کھیل ختم ہوا تو تمام کردار کئی بار رنگ بدل چکے تھے۔کھیل کے اختتام پر رومانی جوڑوں کی ترتیب کچھ یوں تھی۔ ہیرو اور چمپا' راگی اور بواتمیزن۔ رستم اور تانیا۔رستم پورے کھیل کے دوران مسلسل الجھنوں سے دوچار رہا۔تمام کردار بار بار رنگ بدلتے رہے تھے۔وہ ویسے بھی سادہ لوح تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔۔۔کس کا ساتھ دے۔ ہر بار تانیا ہی نے اس کی مدد کی۔ چنانچہ کھیل ختم ہوتے ہوتے وہ تانیا کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہو چکا تھا۔

اس رات گولو کے کاسے پر ہُن برسا۔مفلس خان اور اس کے کنبے نے اس سے پہلے کبھی اتنی کمائی نہیں کی تھی۔ چنانچہ اس رات پورے کنبے کی ترقی ہوئی۔ مفلس خان کو مدتوں کے بعد پہلی بار رات گزارنے کے لیے چھت میسر آئی۔ اس

نے ایک سستے سے ہوٹل میں کرائے پر کمرہ لیا۔۔۔اور آرام وہ بستر پر ٹھاٹ سے سویا۔ازراہِ کرم نوازی اس نے تانیا کو کمرے میں فرش پر ایک چادر بچھا کر سونے کی۔۔۔اور گولو۔۔۔اور گولو کو گاڑی میں سونے کی اجازت دے دی۔ گولو کو گاڑی میں سلانے کا ایک مقصد گاڑی اور تمام سامان کی حفاظت بھی تھا۔ جہاں تک تانیا کا تعلق تھا تو وہ آمدنی میں اس وقتی اضافے کا سبب تھی۔لیکن مفلس خان نے شکریہ ادا کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔اس رات اس نے کھانا بھی ڈٹ کر کھایا۔کھانے کے دوران وہ دانستہ تانیا کو نظرانداز کرتا رہا تھا۔لیکن جب تانیا کی نگاہوں کی چبھن اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی تو اس نے نظر اُٹھا کر تانیا کو دیکھا اور غرایا۔

''تمہاری کارکردگی بہت خراب تھی۔ جب ہیرو نے تم سے چمپا کا دل جیتنے اور اسے حاصل کرنے کی ترکیب پوچھی تو تم جواب دینے کے بجائے ہونقوں کی طرح اسے تکنے لگی تھیں کیوں؟''

تانیا نے اسے حیرت سے دیکھا۔اسے یقین ہوگیا کہ اس کے سامنے بیٹھا ہوا یہ شخص کسی حال میں بھی خوش نہیں ہو سکتا تھا۔وہ پہلے سے زیادہ ناراض' بدماغ اور بدزبان معلوم ہو رہا تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے اسے نفرت کے اظہار کے لیے بہانے کی ضرورت بھی نہ ہو۔اس کی وہ برہمی اور نفرت تانیا کے نزدیک اس کے اور اس کے دوستوں کی پُرسکون زندگی میں مداخلت کے مترادف تھی۔

''میں جانتی تھی کہ ہیرو مجھ سے مشورے کا خواہاں نہیں ہے۔'' اس نے پوری سچائی کے ساتھ کہا۔'' اس نے مجھے اپنے شو میں شامل کرنے سے پہلے ہی مجھ سے وعدہ کرلیا تھا کہ میں اس کے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کروں گی۔ پھر میں جانتی ہوں کہ محبت تو درکنار' وہ چمپا کو پسند بھی نہیں کرتا۔کیوں کہ۔۔۔۔''

وہ کہتے کہتے رُک گئی۔کیوں کہ اس کی نظر آذر کے چہرے پر پڑ گئی تھی' جو غصے کی شدت سے سیاہ پڑ چکا تھا۔''تمہیں کیا معلوم کہ ہیرو کس سے محبت کرتا ہے اور

کس سے محبت نہیں کرتا۔'' وہ بُری طرح چلایا۔ ''تم بہت بے وقوف ہو۔''

ایک لمحے کے لیے تانیا کو ایسا لگا' جیسے وہ کھانے کی پلیٹ اس کے منہ پر دے مارے گا۔ اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ اس شخص سے الجھنا۔۔۔ اسے کچھ سمجھانا بے سود۔۔۔ بلکہ مخدوش ہو گا۔ اب اسے اپنے دوستوں سے جدائی گوارا نہیں تھی۔ ''مم۔۔۔ مجھے معاف کر دیجیے۔'' وہ گھبرا کر بولی۔ ''یقیناً میرا انداز غلط ہو گا۔ میں آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گی۔''

آذر کا غصہ سرد نہیں ہو سکا لیکن اب تانیا پر برسنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ چنانچہ گولو کی شامت آ گئی۔ ''تم کب تک یہاں بیٹھے رہو گے کانے دجّال۔'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''تین دن کا کھانا تو ٹھونس چکے ہو۔ تمہاری ہوس کا پیٹ کبھی نہیں بھرے گا۔ دفع ہو جاؤ۔ کیا میرا اسٹال چوری کروانے کا ارادہ ہے۔''

''یس ماسٹر۔ غلطی ہو گئی۔'' گولو نے بُرا منائے بغیر کہا اور اُٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔

تانیا نے شکر ادا کیا کہ آذر نے کھانا اپنے کمرے ہی میں منگوا لیا تھا۔ اگر یہ سب کچھ ریسٹورنٹ میں ہوتا تو خواہ مخواہ کا تماشا بنتا۔ گولو کے جانے کے بعد وہ چند لمحے خاموش بیٹھی اپنا حوصلہ مجتمع کرتی رہی۔ بالآخر ہمت کر کے اس نے پوچھ ہی لیا۔ ''جناب۔۔۔ آپ ہمیشہ اتنے غصے میں کیوں رہتے ہیں؟''

آذر نے لقمہ پلیٹ میں رکھ دیا اور سرو نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ ''اس لیے کہ تم بے وقوف ہو۔'' اس نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ ''اور میں بے وقوفوں کے ساتھ وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔۔۔ خاص طور پر بے وقوف عورتوں کے ساتھ۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ یہ آپ جناب نہیں چلے گا۔ میرا نام آذر ہے۔۔۔ اور میں جھوٹی عزت سے بلکہ عزت کے نام ہی سے چڑتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں آپ کو آذر صاحب کہہ لوں گی۔'' تانیا نے اختلاف میں

بھی اتفاق کا پہلو نکالا۔

''ہرگز نہیں۔ یہ صاحب بھی نہیں چلے گا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے' جناب۔۔۔ معاف کیجیئے گا۔۔۔'' وہ بُری طرح گڑبڑا گئی۔

''تو تمہیں ضرورت ہی کیا ہے' مجھے پکارنے کی اور مجھے تمہارا نام بھی پسند نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے عورتوں کے نام ہی اچھے نہیں لگتے۔ نام کی ضرورت ہی کیا ہے عورتوں کو۔'' آذر نے زہریلے لہجے میں کہا۔

تانیا کا دل تو دُکھا۔۔۔ لیکن اس نے یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ اس نے یہ بات ذہنی طور پر تسلیم کر لی تھی کہ دنیا کا کوئی مرد اسے پسند نہیں کر سکتا۔ اب آذر کے رویّے سے یہ بات ثابت ہو رہی تھی کہ وہ ہر شخص کے لیے اس حد تک ناقابلِ قبول ہے کہ اس کا نام تک نفرت جگانے کا سبب بن سکتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ۔۔۔۔۔ وہ بے وقوف ہے بلکہ آخری ناکامی کے بعد تو اس کا اپنی فنکارانہ صلاحیت پر سے بھی اعتماد اُٹھ گیا تھا۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر اس نے بلا ارادہ اپنا ہاتھ آذر کے ہاتھ پر رکھ دیا اور بے حد شیریں لہجے میں بولی۔ ''آپ میرے لیے ہیرو' راگی' پروفیسر عقل مند اور چالباز کی طرح مہربان ثابت نہیں ہو سکتے؟ انہوں نے بھی مجھے دیکھتے ہی جان لیا تھا کہ میں انتہائی بے وقوف لڑکی ہوں۔ لیکن انہوں نے کبھی یہ بات میرے منہ پر نہیں کہی۔۔۔ کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔''
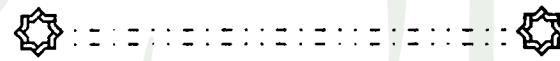
اس کے ہاتھ کے لمس نے آذر کو اور بھڑکا دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ یوں کھینچا' جیسے اسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ ''میں بھی تمہارے لیے مہربان ثابت ہو سکتا تھا۔'' اُس نے پھنکار کر کہا۔ ''لیکن مجھے تمہاری ان گھورتی آنکھوں اور روتی بسورتی معصومیت سے نفرت ہے سمجھیں؟''

اس کا یہ وار اس قدر ظالمانہ تھا کہ تانیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ سر

کو تفہیمی جنبش دے کر رہ گئی۔

''اور جہاں تک اُن کا تعلق ہے' وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔'' آذر نے مزید کہا۔ ''میں ان کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔ وہ تمہیں پسند کرتے ہیں تو کرتے رہیں۔ لیکن تمہارے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ مجھ سے ذرا دور ہی رہو سمجھ گئیں؟''

تانیا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کوشش کروں گی۔''

آذر کے خراب اور بے رحمانہ رویے کا تانیا پر صرف اتنا اثر ہوا کہ وہ اس سے ہمدردی محسوس کرنے لگی۔ اسے اس پر ترس آتا تھا کیوں کہ وہ اپنی نفرت، محرومی اور غصے کے حصار میں محصور تھا۔۔۔ اور ان منفی جذبوں کی سنگین دیواروں سے سر پھوڑنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ وہ اندر سے بے حد مجروح ہے۔۔۔ لہولہان ہے۔ دوسری طرف صنعتی نمائش میں گزرنے والا وہ ایک ہفتہ اسے اپنی زندگی کا خوشگوار ترین عرصہ محسوس ہوتا تھا۔ اس ایک ہفتے میں ساتوں کٹھ پتلیوں کے ساتھ اس کے تعلق کی گرم جوشی میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ وہ انہیں بہتر طور پر سمجھنے لگی تھی۔۔۔ ان کی مزاج آشنا ہو گئی تھی۔ وہ ان کی کمزوریوں اور ان کی فطرت کے مثبت پہلوؤں سے بھی واقف ہو گئی تھی۔ ہیرو بے حد اولوالعزم تھا۔ اس کی خواہشات بلند تھیں اور ان کی کوئی حد بھی نہیں تھی۔ اس کا تخیل بے حد زرخیز تھا۔۔۔ لیکن وہ شو کا انچارج ہونے کی حیثیت سے اپنے تمام ساتھیوں کو اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔ اسی لیے وہ اپنی خواہشات اور تخیلات کو کبھی بے لگام نہیں ہونے دیتا تھا۔ اسے ہمیشہ اپنی ذمے داریوں کا خیال رہتا تھا۔ راگی

خود پسند ہونے کے باوجود طبعاً مہربان آدمی تھا۔ تمام کٹھ پتلیوں میں خود پرست اور مغرور چمپا ہی ایسی تھی' جس کی فطرت میں مہربانی نہیں تھی۔

دیو قامت رُستم اُس پر انحصار کرنے میں سب سے آگے تھا۔ وہ اتنا بے وقوف اور نرم دل تھا کہ ہر شخص اُسے بہ آسانی الو بنا دیتا تھا۔۔۔ اور خوفناک حد تک جاندار ہونے کے باوجود وہ کسی کو خود سے خوف زدہ نہیں کر پاتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے تحفظ اور اپنی مدد کے لیے تانیا کی طرف دیکھتا۔ اس کے اور تانیا کے درمیان ہونے والے مناظر تماشائیوں کو سب سے زیادہ متاثر کرتے تھے۔ تانیا کے انداز میں اس کے لیے ہمیشہ ایک ایسا نرم اور مہربان جذبہ ہوتا' جسے مامتا سے قریب تر کہا جا سکتا ہے۔

تانیا کی بوا تمیزن سے بھی خوب بنتی تھی۔ بُوا ایک ایسی عورت تھی' جس نے نہ صرف زندگی کو برتا تھا بلکہ وہ خود بھی زندگی کے ہاتھوں برتی گئی تھی۔ وہ بے حد تجربے کار اور جہاندیدہ تھی۔ وہ کئی شوہروں کو لحد میں اُتار چکی تھی' لہٰذا مردوں کی فطرت سے بھی بخوبی واقف تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ عورتوں کو اپنے مشترکہ مفادات کے تحفظ کے لیے باہم تعاون کرنا چاہیئے۔ وہ تانیا کو مشورے دینے میں ہمیشہ پیش پیش ہوتی۔ طبعاً وہ بے حد افواہ پسند تھی۔ تانیا کو ہمیشہ اس سے اسٹیج سے ہٹ کر ہونے والی سرگرمیوں کے متعلق معلومات ملتی رہتیں۔ اگرچہ ان میں بیشتر افواہیں ہوتیں لیکن پھر بھی تانیا کو عموماً ایک آدھ کام کی بات معلوم ہو ہی جاتی تھی۔ کٹھ پتلیاں اسٹیج سے ہٹ کر بھی بہت فعال اور سرگرم زندگی گزارتی تھیں۔

لیکن اگر تانیا سے پوچھا جاتا کہ اسے سب سے اچھا کون لگتا ہے تو وہ یقیناً چالباز کا نام لیتی۔ چالباز کی فطرت اسے بہت گہرائی میں کہیں چھو لیتی تھی۔ وہ عیار تھا' لالچی تھا' بد دیانت تھا۔۔۔ اور یہ بات خود بھی جانتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ سُدھر جائے۔۔۔ اور وہ اس سلسلے میں کوشش بھی کرتا تھا۔ لیکن اپنی فطرت

سے جیتنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔۔۔یا شاید اس کی کوشش میں خلوص کی کمی تھی۔ تانیا کو اس کے ساتھ بہت لطف آتا تھا۔ وہ اُسے تنگ کرتا' بے وقوف بناتا کبھی کبھی وہ اس کے خلاف سازشیں کرتا۔۔۔لیکن جب بھی موقع آتا تو یہ بات بھی ثابت ہو جاتی کہ وہی اُسے سب سے زیادہ چاہتا بھی ہے۔۔۔اور اس کی محبت کی سب سے زیادہ ضرورت بھی اُسی کو ہے۔ وہ ڈینگیں بھی بہت بڑھ چڑھ کر مارتا۔ ایک موقع ہمیشہ ایسا آتا جب وہ تانیا کے دل کو چھو لیتا۔۔۔اور تانیا کو خوشی میں بھیگ جانے کا احساس ہوتا۔ ایسا اُس وقت ہوتا' جب اس کی ظاہری شخصیت کا خول چٹخ جاتا' جو ہر اچھائی کو رد کرنے' ہر اچھائی کا مضحکہ اُڑانے اور نفرت کرنے کا عادی تھا۔۔۔ جب اس کی ظاہری شخصیت میں دراڑیں پڑ جاتیں۔۔۔اور تانیا کو اُن دراڑوں سے اُس کے اندر چھپا وہ بچہ صاف نظر آتا' جو چاہتا تھا کہ اُسے اس کی خطاؤں پر معاف کر دیا جائے۔۔۔ اُسے چاہا جائے۔۔۔ وہ بچہ جو محبت کا طلب گار تھا۔ لیکن پھر وہ دراڑیں ذرا ہی دیر بعد جیسے کسی خود کار عمل کے تحت بھر جاتیں' وہ پھر پرانا والا چالباز بن جاتا۔

پروفیسر عقل مند' تانیا کا مشیر بھی تھا اور بہت اچھا دوست بھی۔ اس کے باوجود وہ اس سے ڈرتی بھی تھی۔ کھلونوں کا خالق اور مسیحا صرف مہربانی کی نہیں بلکہ انصاف کی علامت بھی تھا۔۔۔اور اس معاملے میں وہ بے حد سخت تھا۔ اس کی نظر میں گہرائی تھی۔ تانیا کو اس کی نگاہیں اپنے وجود میں اُتر کر کچھ ٹٹولتی۔۔۔ کچھ بھید دریافت کرتی معلوم ہوتیں اور وہ ڈر جاتی۔ اسے احساس ہوتا کہ وہ اُس کے چور خیالات تک پڑھ لیتا ہے۔ یہ محض احساس تھا۔۔۔ کیوں کہ وہ تو یقین سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس کے پاس کچھ چور خیالات بھی ہیں۔ ابھی وہ خود سے آگاہ ہی کہاں تھی۔

پھر گولو تھا' جو اس زمانے کی یاد دلاتا تھا' جب انسان اپنے ہی جیسے

انسانوں کے غلام ہوتے تھے۔ وہ آقا کا غلام تھا۔۔۔وہ کٹھ پتلیوں کا غلام تھا۔۔۔ اور ان کی ہر خدمت کے لیے ہمہ وقت کمر بستہ رہتا تھا۔ اب جب کہ تانیا بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئی تھی تو اس نے از خود اس کی غلامی بھی قبول کر لی تھی۔ تانیا اس سے ادب اور احترام سے بات کرتی تو وہ بے حد حیران ہوتا۔ اس کی اکلوتی آنکھ میں ایک عجیب سا جذبہ چمکتا۔۔۔اور ساتھ ہی اس کے غلامانہ انداز میں اور شدت آ جاتی۔ اس کی زندگی بھی عجیب تھی۔ وہ پتلی تماشے کی حقیقت سے خوب واقف تھا۔ وہ پردے کے پیچھے آقا کا ہاتھ بٹاتا۔۔۔ پتلیوں کے لباس تبدیل کرتا۔۔۔ انہیں ترتیب سے لٹکاتا تا کہ اسٹیج پر کردار اس تیزی سے نظر آئیں کہ تماشائیوں کو ڈوریاں ہلائے جانے کا احساس ہی نہ ہو۔ لیکن جب وہ سامنے والے حصے میں میوزک ڈائریکٹر کے فرائض انجام دینے کے لیے جاتا جہاں تانیا بھی موجود ہوتی۔ تو وہ اُن کٹھ پتلیوں کو جیتے جاگتے انسان سمجھتا۔۔۔ جیسے وہ اس کی اور تانیا کی طرح سچ مچ کے ہوں۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی۔۔۔ اُن کو چھو کر' برت کر بھی اُن کے وجود پر اس کے یقین میں کمی نہیں آتی تھی۔

کٹھ پتلیوں کے وجود پر یقین تانیا اور گولو کے درمیان ایک قدرِ مشترک تھا لیکن دونوں کے یقین کے اسباب اپنی بنیاد میں بالکل مختلف تھے۔ تانیا کا یقین تانیا کی ضرورت کی بنیاد پر قائم تھا۔ وہ یقین زندگی کے تُند و تیز طوفان میں اُس کے لیے پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ پناہ گاہ نہ ہوتی تو طوفان اُسے بہا لے جاتا۔ ان کے وجود پر یقین ہی اُسے موت سے زندگی کی طرف کھینچ لایا تھا۔ پھر اس یقین کے پیچھے منطقی وجوہات بھی تھیں۔ اس نے پتلی تماشے کا صرف تذکرہ سُنا تھا' دیکھا کبھی نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ پتلی تماشے کا طریقۂ پیشکش کیسا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے آذر کو نہ کبھی اسٹال میں داخل ہوتے دیکھا تھا اور نہ نکلتے۔ اس اعتبار سے آذر اُسے متلوّن مزاج اور پُراسرار لگا تھا کہ اس کی آمد و رفت کا پتا ہی نہیں چلتا تھا کبھی

کبھی تو وہ سارا دن اسٹال میں پردے کے پیچھے بیٹھ کر اس طرح گزار دیتا کہ ایک لمحے کے لیے بھی اُس کی موجودگی کا احساس نہ ہوتا۔ اس عرصے میں کوئی ایک پتلی بھی اسٹیج پر نظر نہ آتی۔ یہ بات تانیا کو سمجھانے کے لیے کافی تھی کہ آذر ہی کٹھ پتلیوں کو نچاتا ہے لیکن وہ یقین کرنا چاہتی تب نا۔ جب آدمی کسی بات کو رد کرنے پر تل جائے تو وہ سامنے کی حقیقتوں کا بھی منکر ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی تھا کہ مفلس خان اور اہلِ خانہ میں صرف ہیرو کی چلتی تھی۔ آذر خود کبھی کوئی ہدایت نہ دیتا۔ اُسے جو کچھ بھی کہنا ہوتا۔۔۔ جو کچھ بھی کروانا ہوتا' وہ ہیرو کے ذریعے کہلواتا۔ ہیرو ہی پلاٹ تیار کرتا' ریہرسل کرواتا' نئے نغمے منتخب کر کے اُن کی دُھنیں بنواتا اور وہی ہر کٹھ پتلی کے لیے کردار کا انتخاب کرتا۔ اب تانیا کے لیے ان کٹھ پتلیوں سے گفتگو کرنا فطرتِ ثانیہ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ وہ اُن سے گفتگو کیے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سب فطرت اور مزاج کے اعتبار سے اتنے مختلف تھے کہ ایک رنگا رنگ کنبہ معلوم ہوتے تھے۔ تانیا انہیں ایک چڑ چڑے' بد دماغ' بدتمیز اور بد زبان شخص سے کیسے منسوب کرتی۔ اُسے اُن کا خالق کیسے تسلیم کرتی۔

ایک ہفتہ گزرنے پر میلہ ختم ہو گیا اور تین دن تک آوارگی کا دور چلتا رہا۔ وین اِدھر اُدھر بستی بستی' گلی گلی بھٹکتی پھری۔ جب آذر کا موڈ ہوتا' تماشا بھی ہو جاتا۔ ایک بات بہر حال طے تھی۔ مفلس خان اور اہلِ خانہ کی آمدنی میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اب آذر' تانیا کے لیے بھی علیحدہ کمرہ لینے لگا تھا۔ تانیا بہت خوش تھی۔

پھر ایک رات عجیب سانحہ گزرا۔ آذر نشے میں بدمست' لڑکھڑاتا ہوا اپنے کمرے سے نکلا اور تانیا کے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔۔۔ رات بہت ہو چکی تھی اور آذر کو بے وقت بھوک لگی تھی۔ دوسری بھوک! اس وقت اُسے کچھ بھی نہیں مل سکتا تھا۔ وہ سوچتا اور کڑھتا رہا۔ پھر اچانک اُسے

خیال آیا کہ اس کے غلاموں میں ایک غلام کا اضافہ بھی تو ہوا ہے۔ ہاں۔۔۔ تانیا اُس کی جاگیر ہی تو تھی۔ وہ کمرے کے سامنے ٹھہر گیا۔ کمرے میں تاریکی تھی اور تانیا بستر پر بے سُدھ پڑی سو رہی تھی۔ آذر نے صرف چند لمحے غور کیا۔ پھول بننا تو ہر کلی کے لیے اعزاز ہوتا ہے اور پھر ایسی کلی' جو پھول بننے سے پہلے مرجھائی جا رہی ہو۔ اس نے سوچا کہ وقت آ گیا ہے کہ اب اس کی معصومیت اور بے خبری پر آگہی کے کرب کا دروازہ کھول دیا جائے اور آگہی بھی وہ جو انسانیت کی توہین و تذلیل میں لتھڑی ہوئی ہو۔ اس کے علاوہ اس عمل میں منفعت کا ایک پہلو بھی نکلتا تھا۔ بھوک کو صرف تشفی سے غرض ہوتی ہے' اس سے نہیں کہ روٹی خریدی گئی ہے یا چھینی گئی ہے۔ البتہ جیب کو مفت کی روٹی ہی اچھی لگتی ہے۔ اس پر ایک کمرے کے کرائے کی بچت۔ دو کمرے غیر ضروری تھے۔ بلکہ یہ زبردست فضول خرچی تھی۔ آذر نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ دو کمرے نہیں لیے جائیں گے۔

لیکن اس شب خون کے پسِ پردہ ایک تاریک اور شرمناک مقصد بھی تھا۔ اگرچہ آذر کسی کے سامنے اس بات کا اعتراف کبھی نہ کرتا۔ آذر کو تانیا کی شرافت اور معصومیت سے نفرت تھی۔ وہ اُسے اُس کی اخلاقی گراوٹ اور پستی کا احساس دلاتی تھی۔ یہ احساس اُسے اُسی وقت ہو گیا تھا' جب اُس نے تانیا کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اب وہ اس سلسلے میں مزید اذیت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اُسے اپنی سطح پر لانے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔

وہ دبے پاؤں دروازے پر پہنچا اور چند لمحے سُن گُن لیتا رہا۔ پھر اس نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

تانیا اگلی صبح جاگی تو کمرے میں اتری ہوئی دُھوپ اُسے ڈراؤنے خواب جیسے اُس سانحے کی نفی کرتی محسوس ہوئی' جو رات اس پر گزرا تھا۔ اس سانحے کے

بعد اُس کا خیال تھا کہ اب وہ سو نہیں سکے گی۔ لیکن سوچتے سوچتے اس کا دُکھتا ہوا جسم نیند کے پُرسکون پانیوں میں اُتر گیا تھا اور اب صبح ہو چکی تھی۔

وہ بستر سے اُٹھی اور کھڑکی کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے باہر سڑک کی طرف جھانکا اور حیران رہ گئی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ لوگ اپنے اپنے کام پر جا رہے تھے۔ بڑی گہما گہمی تھی وہاں۔ اُس کی رونق لٹنے سے دنیا کی رونق پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ نہ جانے کیوں اُسے اپنا گھر' باپ اور ماں یاد آ گئے۔ ماضی کی خوشگوار یادیں یوں اُبھریں' جیسے اس کے زخمِ تذلیل پر مرہم لگانے آئی ہوں۔ کچھ دیر کے لیے وہ خود کو ایک چھوٹی سی بچی سمجھنے لگی' جسے کبھی ماں باپ کی محبت اور شفقت اور تحفظ کی چھت میسر تھی۔

پھر ان خوشگوار یادوں کے پیچھے سے گزشتہ رات کی ڈراؤنی یادیں جھانکنے لگیں۔ اس نے آذر کی زیادتی پر نہ کوئی احتجاج کیا تھا۔ نہ مزاحمت۔ وہ رات کی گناہگار تاریکی میں آیا تھا اور اس تاریکی ہی میں اُسے لُوٹ کر چلا گیا تھا' اُسے شرمسار چھوڑ کر۔ ذلت اور آلودگی کے احساس میں تر بتر چھوڑ کر۔ اس کی روح تک پامال ہو گئی تھی۔ وہ چونک کر جاگی تھی اور اُسے جاگتے ہی اپنی کیفیت سمجھنے سے پہلے ماضی کا ایک منظر یاد آیا تھا۔ بچپن میں اس نے ایک جسیم بلے کو ایک چھوٹی سی چوہیا پر جھپٹتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد اُسے احساس ہوا تھا کہ وہ بھی ایک چھوٹی سی چوہیا ہے۔ کمرے میں تاریکی تھی لیکن ڈھلتے چاند کی مدھم چاندنی میں اُسے اپنے قاتل کی ایک جھلک نظر آ گئی۔ ویسے وہ جھلک نظر نہ آتی' تب بھی وہ اُسے پہچان لیتی۔ اس کی جبلت اسے بتا دیتی۔ گزشتہ کئی روز سے اسٹال میں پردے کے پیچھے بیٹھے ہوئے آذر کی نگاہیں اُسے اپنے وجود میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں اور فطرت نے بڑے موہوم اور ناقابلِ فہم انداز میں اسے سمجھا دیا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔
ایک لمحے کے لیے تو جیسے اُس کا دل دھڑکنا ہی بھول گیا۔ اُس نے سوچا'

شاید آذر اُس سے محبت کرتا ہے۔ اُسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ اس صورت میں وہ اُس کے لیے سب کچھ قربان کر سکتی ہے لیکن جب چاندنی میں اُس نے آذر کی آنکھیں دیکھیں تو اُس کی خوش فہمی دور ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں میں محبت کی روشنی نہیں تھی بلکہ اس کے دل کی تاریکی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر محبت بھری سرگوشیاں نہیں تھیں بلکہ نفرت اور ہوس کی پھنکاریں تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ چیخنا' چلانا بے سود ثابت ہو گا۔ سوائے اس کے کچھ بھی تو نہ ہوتا کہ وہ سر چھپانے کا آخری ٹھکانا بھی کھو بیٹھتی۔ اس کے بعد وہ کہاں جاتی؟ پھر آذر نے اُسے موقع ہی کب دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتی' وہ اس کے کمرے' اس کے ہوش و حواس' اُس کے بستر اور اُس کے وجود پر قابض ہو چکا تھا۔ اُس کے انداز میں اتنی وحشت اور دیوانگی تھی کہ تانیا کی ذہنی اور روحانی اذیت دو چند ہو گئی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ وہ مر جائے گی۔

پھر وہ چلا گیا' اسے شرمسار چھوڑ کر۔ تانیا کو اپنے لٹنے کا غم نہیں تھا۔ اُسے تو بس یہ غم تھا کہ مانگنے والے نے محبت سے کچھ نہیں مانگا۔ بلکہ ڈاکو بن کر لوٹ لیا۔ صرف یہی نہیں' اُس نے آذر کی جارحیت کے پیچھے اپنے لیے نفرت بھی چھپی ہوئی دیکھی تھی۔ اُسے اُمید کی ایک کرن بھی نہیں دکھائی دی تھی کہ اُس کے اور آذر کے درمیان نفرت اور بیگانگی کی خلیج کبھی پٹ سکے گی۔ آذر کے سینے میں شاید انسانی دل تھا ہی نہیں۔

تانیا کو ایک بات اور پریشان کر رہی تھی۔ ذلت اور اذیت اُٹھانے کے باوجود آذر کے لیے اس کی پسندیدگی کم نہیں ہوئی تھی بلکہ اب تو ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کے لیے لازم ہو گیا ہے۔ جیسے وہ ہمیشہ کے لیے اُس کی ہو چکی ہے۔

وہ دیر تک ان تاریک یادوں' سنگین خیالوں اور خوفزدہ کرنے والی سوچوں میں اُلجھی رہی۔ لیکن نہاتے وقت اُسے ایسا محسوس ہوا' جیسے وہ سب کچھ محض راستے کی گرد تھی' جسے پانی نے دھو دیا ہے۔ وہ غسل خانے سے تر و تازہ نکلی۔ اب

وہ تن بہ تقدیر تھی اور آنے والا دن اس کے لیے جو کچھ لانے والا تھا' اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی۔

اور پھر ویسا ہی ایک معجزہ رونما ہوا' جس نے اُسے نئی زندگی دی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بھی اور دنوں کی طرح ایک عام سا دن ہے۔ اُس کے ساتھی اُس کے دوست اب بھی اس پر مہربان تھے بلکہ پہلے سے زیادہ مہربان تھے۔ حسب معمول ہیرو نے چہکتی ہوئی آواز میں اُس کا استقبال کیا۔ ''ہیلو تانیا۔۔۔ کہاں ہو تم؟ تمہیں پتا بھی ہے۔ آج ناشتے میں حلوہ ملے گا۔'' پھر اس نے گولو کو پکارا۔

''گولو۔۔۔ اے گولو' تانیا کو اس کے حصے کا حلوہ کر دو۔''

اسٹال کے عقب سے گولو نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی۔ پلیٹ میں پوریاں تھیں۔ اور اوپر والی پلیٹ میں حلوہ رکھا تھا۔ اسی وقت چالباز اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوری تھی' جس پر تھوڑا سا حلوہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے پوری تانیا کی طرف بڑھائی۔ ''اے لڑکی۔۔۔ یہ میں نے اپنے حصے میں سے تمہارے لیے بچایا ہے۔ حالانکہ مجھے حلوہ بہت پسند ہے۔۔۔''

اسٹیج کے نیچے سے ایک احتجاجی چیخ سُنائی دی' جسے سُن کر ہیرو غوطہ لگا گیا۔

اسی لمحے رستم اوپر آ گیا۔

''اوہ چالباز۔۔۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' تانیا' چالباز سے کہہ رہی تھی۔ ''واقعی' تم نے میرے لیے بڑی قربانی دی ہے۔ تم میرا بڑا خیال رکھتے ہو۔۔۔''

''اے۔۔۔ میرا حلوہ پوری کس نے چرایا ہے۔'' رستم نے چیخ کر کہا۔

''وہ میں نے تانیا کے لیے بچایا تھا۔''

تانیا نے چالباز کو گھور کر دیکھا۔ ''چالباز۔۔۔ یہ تمہاری حرکت تو نہیں ہے۔۔۔'' لیکن اُسے جواب کی ضرورت نہیں تھی۔ چالباز کے چہرے پر خفت

کٹھ پتلیاں

احساسِ جرم کی تحریر بے حد واضح تھی۔

تانیا اپنی تمام پریشانیاں اور اذیتیں بھول گئی۔ اس نے سخت لہجے میں چالباز سے کہا۔ ''تم رستم کی چیز فوراً اُسے واپس کر دو۔'' پھر وہ رستم سے مخاطب ہو گئی۔ ''رستم۔۔۔ اب تم مجھے یہ دے سکتے ہو۔''

دیو قامت رستم نے چالباز سے پوری لے کر تانیا کی طرف بڑھا دی۔

''یہ سب صرف اس وجہ سے ہے کہ میں بے حد احمق ہوں۔'' اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''چالباز نے مجھ سے یہ پوری یہ کہہ کر لی تھی کہ وہ اپنی پوری سے اس کا موازنہ کرنا چاہتا ہے۔ میں اس کی باتوں میں آ گیا۔۔۔''

تانیا نے رستم سے پوری لی اور اُس کی پیشانی چوم لی' ''بے چارہ رستم۔'' اس نے چمکار کر کہا۔ ''خیر تم کوئی فکر نہ کرو۔ بے اصولی کے مقابلے میں لوگوں پر اعتبار کر کے نقصان اُٹھانا نسبتاً بہتر ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ ہم میں بہت سے بے اصول لوگ موجود ہیں۔''

چالباز نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا اور بولا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں تانیا۔ میں بڑے خلوص سے تمہارے لیے حلوہ پوری بچانا چاہتا تھا۔ میں نے بچا بھی لی تھا۔ اس کے باوجود میں وہ خود ہی کھا گیا۔''

تانیا نے بے حد تلخی سے اُسے دیکھا لیکن جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں تلخی کے ساتھ ساتھ محبت بھی تھی۔ صبح سے وہ اپنے دل کو جس اَن دیکھی آہنی مٹھی کی گرفت میں محسوس کر رہی تھی' وہ آہستہ آہستہ ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔ اداسی کی تہیں اُتر رہی تھیں۔ بچے کو اس کے کھلونے مل گئے تھے۔ ''چالباز۔۔۔ تم۔۔۔'' اس نے آہستہ سے کہا لیکن جملہ پورا نہیں کیا۔

چالباز نے بھانپ لیا کہ وہ نرم پڑ چکی ہے۔ اُس نے مسکین سی صورت بنائی اور اپنا سر تانیا کی گردن سے رگڑنے لگا۔ اسٹیج کے دور افتادہ گوشے میں چند

لمحوں کے لیے بواتمیزن نمودار ہوئی اور جھاڑن سے اَن دیکھی گرد جھاڑنے لگی۔ انداز بے حد جارحانہ تھا۔ جیسے چالباز کو جھاڑن سے مار رہی ہو۔ ''میں نے تمہیں پہلے ہی خبر دار کر دیا تھا کہ اس مکار، صورت حرام لومڑ پر ایک لمحے کے لیے بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔'' اس نے تانیا کو ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا۔ ''لیکن تم کہاں سمجھتی ہو۔ سمجھو بھی کیسے؟ تم نے میری طرح متعدد شوہر قبر میں کہاں اتارے ہیں۔ میں۔۔'' وہ جملہ پورا کیے بغیر اسٹیج سے اُتر گئی۔

اگلے ہی لمحے ہیرو نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دس کا نوٹ تھا۔ نوٹ اُس نے تانیا کی طرف بڑھایا۔ ''یہ تمہارے لیے ہے تانیا، پچھلے ہفتے کی تنخواہ'' اس نے چہک کر کہا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہو، ہیرو!'' تانیا کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں تم لوگوں کے ساتھ اس لیے تو نہیں۔۔۔''

''تم اس چکر میں نہ پڑو۔'' ہیرو نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''آج صبح ہمارا اجلاس ہوا۔ اس میں تمہیں حصے دار بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ صدارت پروفیسر نے کی تھی۔ اس نے سینتالیس منٹ تک صدارتی تقریر کی، بعد میں یہ قرارداد پاس کی گئی۔۔۔''

اس دوران ایک نوجوان لڑکی کو کٹھ پتلیوں سے بڑی سنجیدگی سے ہم کلام دیکھ کر اچھے خاصے لوگ اکٹھا ہو گئے تھے۔ گویا پتلی تماشا شروع ہو چکا تھا۔

دن گزرتے رہے۔ موسم بدلتے رہے۔ وین بستی بستی گھومتی رہی۔ میلوں میں، نمائشوں میں پتلی تماشا دکھایا جاتا رہا۔ ایک میلے سے دوسرے میلے تک سفر کے دوران لوگوں کے اصرار پر فرمائشی شو بھی ہوتے رہے۔ اس دوران پولیس اور

شہری انتظامیہ سے بھی بارہا سامنا ہوا۔ پولیس والے آتے اور شو کے سلسلے میں اجازت نامہ طلب کرتے۔ ایسے میں انہیں ہیرو، چالباز، بواتمیزن یا پروفیسر سے مذاکرات کرنے پڑتے۔ ایسے ہر موقع پر تانیا دونوں فریقوں کے درمیان وضاحت کا فرض انجام دیتی۔ وہ سب مل کر پولیس والوں کے بھی دل جیت لیتے۔ یوں انہیں کوئی دشواری پیش نہ آتی۔

تانیا کی شمولیت کے بعد اس گھرانے کے دن پھر گئے تھے۔ وہ لوگ ٹھیک ٹھاک کھانا کھاتے۔ فاقوں کا کڑا وقت بیت چکا تھا۔ آذر شب بسری کے لیے کسی سستے سے ہوٹل میں ایک کمرہ لیتا۔ تانیا بھی اُسی کمرے میں سوتی جاگتی۔ اذیت کا احساس مدھم ہوتا جارہا تھا۔ البتہ وہ محبت کے لیے ترس رہی تھی اور محبت وہ جنس تھی، جس سے آذر واقف ہی نہیں تھا۔

یوں غیر محسوس طریقے سے تانیا آذر کی ملکیت کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اسے احساس نہیں تھا کہ وہ بھی آقا کے غلاموں میں شامل ہو گئی ہے۔

دن گزرتے رہے اور وہ بے حد سحر انگیز دن تھے لیکن راتیں اذیت سے عبارت تھیں۔ آذر اُس کے قریب آتا تو بھی اذیت ہوتی اور وہ بھی پہلو بدل کر، اُسے نظر انداز کرتے ہوئے خاموشی سے سو جاتا، تب بھی اس کا بدن توقعات کے بوجھ تلے، خدشات کی تیز ہوا میں کسی سوکھے پتے کی طرح لرزتا۔ وہ جاگتی رہتی۔ خدشات اُسے ستاتے رہتے اور کبھی کبھی اس کا بدن جلنے لگتا اور اس کا سبب اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ کبھی وہ کمرے میں آتا تو اس کا یہ حال ہوتا کہ قدم رکھتا کہیں تو پڑتے کہیں اور وہ نشے میں دُھت ہوتا۔ ایسے میں تانیا اسے سنبھالتی، اُس کا خیال رکھتی، اسے تھپک تھپک کر یوں سُلاتی جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہو اور پھر خود دیر تک جاگتی اور اس کے بارے میں سوچتی رہتی۔ وہ درمیان میں جب بھی کبھی اُٹھتا، وہ اُٹھ کر اسے پانی پلاتی اور تھپک تھپک کر دوبارہ سُلا دیتی۔ ایک رات آذر کو بخار ہو گیا۔

بخار بہت شدید تھا اور آذر ہذیان بک رہا تھا۔ تانیا نے اس کا ہاتھ تھام کر دیکھا
لرز کر رہ گئی۔ آذر کے جسم سے جیسے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ وہ رات بھر پٹیاں بھگو
کر اس کی پیشانی پر رکھتی رہی۔ صبح جب بخار اترا تو آذر نے بڑی نفرت سے اُ
دھکیل دیا اور غرا کر بولا۔ ''لعنت ہو تم پر۔ تم نے میرا پورا جسم بھگو دیا۔ کیا مصیب
ہے۔'' وہ ڈبڈبائی ہوئی خاموش نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہی۔

آذر اُن دنوں کچھ زیادہ ہی پینے لگا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی مگر تانیا
دیکھ کر بھولی بسری تلخ یادیں اُبھر آتی تھیں اور وہ ان یادوں کو جامِ مے میں غ
کرنے کی کوشش کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک عجیب سا احساس اُسے گ
رہتا تھا لیکن وہ اس احساس کو کوئی مفہوم بھی نہیں دے پاتا تھا۔ ایک طرف تو وہ
کو بری طرح نچوڑ رہا تھا۔ اس سے مالی منفعت بھی حاصل کر رہا تھا اور اسے پا
بھی کر رہا تھا۔ وہ اس کے لیے ایک ایسا اثاثہ ثابت ہو رہی تھی، جس کی قی
گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ
کے لیے روٹی کی مانند تھی، جو مفت پیٹ بھرتی ہے اور جواب میں کچھ طلب نہیں کرتی
بس ایک بات مایوس کن تھی۔ اتنی پامالی کے باوجود تانیا کی معصومیت برقرار تھی۔
اب بھی کسی اچھوتی کلی کی طرح پاکیزہ، معصوم اور دُھلی دھلائی نظر آتی تھی۔
اس کے جسم کو داغدار کر چکا تھا۔ لیکن اس کی روح کو تسخیر کر کے آلودہ نہیں کر سکا
یہ بات بھی اس کی جھنجلاہٹ میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس کی مے نوشی میں اضافے
ایک سبب یہ بھی تھا۔

آذر اُس کی معصومیت کو مٹانے پر تُلا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تماشائی
کے تماشے کی طرف کھنچنے کا اصل سبب تانیا کی معصومیت ہی ہے اور اس کی معصو
ہی تماشے اور تماشائیوں کے درمیان پُل کا کام کرتی ہے۔ اس کے باوجود وہ
معصومیت کے درپے تھا۔ وہ تانیا کو پوری طرح اپنے رنگ میں رنگنا چاہتا تھا۔ ا

اپنی طرح آلودہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اُس نے انتہائی خوفناک طریقہ اختیار
کیا تھا۔ جیسے لوہے کو توڑنے کے لیے اُسے بار بار تپا کر، اُس پر ٹھنڈا پانی ڈالا جاتا
ہے، وہی ترکیب وہ تانیا پر استعمال کر رہا تھا۔ وہ رات بھر اس کی تذلیل کرتا اور اس
کے بعد دن میں اس کی کٹھ پتلیاں تانیا کی عزت افزائی کرتیں۔ اس کے زخمی
احساس پر مرہم رکھتیں۔ چنانچہ تانیا ہر صبح عزت کی راکھ سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے
اُٹھتی۔ ہر رات آذر اُس کی تذلیل کے لیے مختلف حربے اختیار کرتا۔ کبھی اس پر
زبان کے کوڑے برساتا۔ کبھی اس کی پٹائی لگاتا اور کبھی اسے یوں برتتا، جیسے وہ
کوئی بازاری عورت ہو لیکن ہر رات تانیا سونے کے لیے لیٹتی تو جوہی کی اُس کلی کی
طرح معصوم ہوتی، جسے پاکیزہ شبنم نے غسل دیا ہو۔ ایسا لگتا، جیسے عزت راکھ ہونے
کی بجائے کُندن ہو گئی ہو۔ آذر رات کے وقت جتنی بے رحمی اور سفاکی کا مظاہرہ
کرتا، دن میں کٹھ پتلیاں تانیا کے ساتھ اتنی ہی محبت اور مہربانی کے ساتھ پیش
آتیں۔ آذر کو ایسا محسوس ہوتا، جیسے پتلیوں پر اس کا کنٹرول بالکل بھی نہیں رہا ہو۔
تانیا کا یہ حال تھا کہ وہ بیک وقت دو دنیاؤں میں رہ رہی تھی۔ اس کے لیے ہر روز
مسلسل اذیت اور مسرت کا سفر تھا، جس میں کبھی ایذائیں اس کی ہم سفر ہوتیں اور
کبھی روح کو سرشاری میں تربتر کر دینے والی خوشیاں۔ زندگی کے یہ دو متضاد روپ
قدم قدم اس کے ساتھ چل رہے تھے۔

ایک رات آذر نے عجیب انداز میں ضرب لگائی۔۔۔۔ کاری ضرب!
وہ بہت رات گئے اپنے کمرے میں داخل ہوا لیکن تنہا نہیں بلکہ ایک ادا فروش عورت
اس کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں بری طرح مدہوش تھے اور اُن کے قدم لڑکھڑا رہے
تھے۔ آذر نے لائٹ آن کی اور بستر پر لیٹی ہوئی تانیا کو گھورنے لگا۔ تانیا ہڑبڑا کے
اُٹھ بیٹھی۔

''اُٹھو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' آذر نے چیخ کر کہا۔

تانیا نیند سے اُٹھی تھی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ وہ ہونقوں
طرح منہ کھولے اسے دیکھتی رہی۔

''میں کہتا ہوں' دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' آذر پھر دہاڑا۔''تمہا
صورت دیکھ کر میرا جی متلانے لگتا ہے۔''

تانیا کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا۔''کیا۔۔۔کیا مطلب۔۔۔کہ
جاؤں میں۔'' وہ ہکلائی۔

''جہنم میں جاؤ۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔ بس تم اُٹھ جاؤ۔ میں دس سیکنڈ
یہ بستر خالی دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ ایک اور طرح کی شرمندگی سے روشناس کرانے والا لمحہ تھا۔ اس
کے لیے تذلیل کا ایک نیا اور انتہائی بھیانک انداز تھا۔ ادا فروش عورت ا
چڑانے والے انداز میں دیکھ رہی تھی' جیسے اُس کا مذاق اُڑا رہی ہو۔ یہ سب
اس لیے اور زیادہ توہین آمیز محسوس ہو رہا تھا کہ آذر اسے یوں استعمال کرتا ا
جیسے وہ پہنا جانے والا کپڑا ہو۔ کمرے سے نکلتے ہوئے اس کے ذہن میں جو ا
خیال تھا' وہ خودکشی کا تھا لیکن اس کا ذہن اس قدر اُلجھا ہوا تھا کہ اُس کی سمجھ
خودکشی کا طریقہ ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی ہوٹل سے نکل آئی۔ اسے
نہیں تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ سڑک تاریک تھی۔ وہ آگے بڑھنے لگی۔ پھر ا
جلتی ہوئی سگریٹ کا سرا نظر آیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ وہ گولو تھا
وین کے بونٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ تانیا کو دیکھتے ہی وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایسا لگتا تھا جیسے
اس کا منتظر رہا ہو۔ اس نے آگے بڑھ کر تانیا کا ہاتھ تھام لیا۔

''میرے ساتھ آؤ بے بی۔ میں نے تمہارے سونے کا بندوبست
ہے۔'' اس نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ تانیا کا منتظر تھا۔ اس نے
کو ایک بازاری عورت کے ساتھ ہوٹل کی طرف جاتے دیکھا تھا اور سمجھ گیا تھا

ہونے والا ہے۔ اس نے فوراً ہی وین کے عقبی حصے کی صفائی کر ڈالی تھی۔

اس نے وین کا عقبی دروازہ کھولا۔ تانیا اندھا دھند سیٹ پر ڈھیر ہو گئی
تھی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی وجہ سے اس کے لیے کچھ بھی دیکھنا ممکن نہیں رہا تھا
اور وہ آنسو گولو کو دیکھنے کے بعد اس کی آنکھوں میں مچلے تھے۔ وہ سیٹ پر لیٹی اور
پھر جیسے اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ کسی ننھے بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔
قریب ہی کسی گھڑیال نے تین بجنے کا اعلان کیا۔

گولو نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ننھا منا ناتواں ہاتھ تھام لیا اور چمکارتے
ہوئے بولا۔''نہ رو۔'' اس کے سخت اور کھردرے ہاتھ میں اس وقت بلا کی نرمی
اور ملائمت تھی۔''میری بچی! انسان کو بہرحال' خدا کی رضا میں خوش رہنا چاہیے۔
پھر سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

تانیا کی گریہ وزاری اور بڑھ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس
کے آنسو کبھی نہیں رکیں گے۔ جیسے اس کا پورا وجود آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ جائے
گا۔

گولو ایک طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا۔''تانیا! میری بیٹی
تانی۔'' اس نے بڑے پیار سے اُسے پکارا۔''تانیا! اِدھر دیکھو۔۔۔دیکھونا۔''
اس کے لہجے میں التجا تھی۔

اس کے التجائیہ اصرار نے تانیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے اپنے چہرے پر
سے ہاتھ ہٹائے اور گولو کو دیکھا۔ پھر اُس کی آنکھوں سے بے یقینی جھلکنے لگی۔ درمیانی
سیٹ کے اوپر سے ہیرو اور چالباز جھانک رہے تھے۔

''ہیرو۔۔۔چالباز۔۔۔'' تانیا خوشی سے چلائی اور پھر فوراً ہی افسردہ
ہو گئی۔''میرے دوستو۔۔۔'' لیکن اس نے بات پوری نہیں کی۔ اچانک ہی جیسے
اُس کا دل محبت سے معمور ہو گیا۔ یک لخت وہ ساری شکایتیں بھول گئی۔ اب وہ

سراپا محبت تھی لیکن اَنا کے زخم میں اب بھی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

ہیرو اور چالباز پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ ان کی خامو
بہت سنگین محسوس ہو رہی تھی۔ اُن دونوں کے درمیان گولو کا چہرہ تھا اور پسینے
چمکتا ہوا وہ چہرہ بے حد غیر حقیقی نظر آ رہا تھا لیکن اس چہرے پر دیوتاؤں جیسی غیر
محبت تحریر تھی۔ ''یہ میرے کہنے سے نہیں بولتے۔'' اس نے ہیرو اور چالباز کی طر
اشارہ کرتے ہوئے بے حد اُداس لہجے میں کہا۔ ''لیکن تانی بے بی۔۔۔ یہ تم
بہت پیار کرتے ہیں۔ اس لیے میں انہیں یہاں لے آیا ہوں تا کہ تمہیں یہ یاد آ جا
کہ تم سے محبت کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ تم سے محبت کرتے ر
گے بے بی۔''

تانیا نے ہاتھ بڑھا کر دونوں کٹھ پتلیوں کو تھام لیا۔ چند لمحے وہ اُنہیں
پاش نظروں سے دیکھتی رہی۔ ان کے بے جان وجود اس وقت اسے خود کو تقو
بخشتے محسوس ہو رہے تھے۔ پھر اچانک وہ بہت زور سے چیخی۔ ''گولو۔۔۔ گولو!!
آخر وہ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہے۔ وہ اتنا ظالم کیوں ہے؟ اتنا خراب کیا
ہے وہ؟''

گولو جواب دینے سے پہلے کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے بڑے ٹھہ
ہوئے لہجے میں کہا۔ ''گولو کی آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے بے بی۔ گولو جا
ایک نظر میں پہچان لیتا ہے۔ آقا بھی جادو کا شکار رہے۔ اس کی روح اس کا جسم چ
دیتی ہے اور اس کے جسم پر کوئی باغی۔۔۔ خراب روح قابض ہو جاتی ہے۔ گو
سب سمجھتا ہے بے بی۔''

تانیا یہ بات سمجھ سکتی تھی۔ رگوں میں دوڑنے والے خانہ بدوش خون
حوالے سے یہ باتیں اس کے لیے نئی نہیں تھیں۔ ''تو گولو۔۔۔ تم اس سے نفرت نہ
کرتے؟'' اس نے پوچھا۔

گولو نے ایک اور سگریٹ نکال کر سلگایا۔ دیا سلائی کی روشنی میں اس کی
واحد آنکھ بے حد چمک دار نظر آ رہی تھی۔ ''نفرت تو کمزوری کی علامت ہے
بے بی۔'' اس نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ ''جو لوگ محبت نہیں کر پاتے' وہ نفرت
کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ نفرت سے اسے کوئی نقصان نہیں ہوتا' جو نفرت کا نشانہ
ہو۔ اس کے برعکس نفرت کرنے والا ہی' خسارے میں رہتا ہے۔''

تانیا نے ایک گہرا سانس لیا اور بے حد تند لہجے میں بولی۔ ''کچھ بھی ہو'
میں نفرت کرتی ہوں اُس سے۔۔۔ شدید نفرت۔۔۔ اور ہمیشہ کرتی رہوں گی۔''

گولو نے سگریٹ کا کش لیا اور ایک سرد آہ بھری۔ گرد و پیش میں سناٹا ہی
سناٹا تھا۔ ''ہاں بے بی۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کبھی کبھی نفرت کیے بغیر رہا بھی
نہیں جاتا لیکن میں یہی کہوں گا کہ محبت نفرت سے بہتر ہے۔ اذیت تو دونوں میں ہے
لیکن بڑا فرق ہے۔ محبت کے دُکھ حسین گیتوں کی تخلیق کرتے ہیں جبکہ نفرت تخلیقی
صلاحیتوں کو سلب کر لیتی ہے۔ پھر انسان نفرت کے بجائے محبت ہی کیوں نہ کرے۔
ویسے بھی نفرت کا دُکھ انسان کو اندر سے چاٹ ڈالتا ہے۔ جبکہ محبت کا دُکھ انسان کو
جلا دیتا ہے۔ کندن بنا دیتا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ماؤتھ آرگن ہونٹوں سے لگا لیا۔
اگلے ہی لمحے ایک جانی پہچانی دُھن فضا میں گونج اُٹھی۔ کم از کم اُن لمحوں میں وہ
دُھن روح کے تار چھیڑ رہی تھی۔ کائنات میں بس ایک ہی آواز
تھی۔۔۔۔۔۔

''اللہ ہی اللہ کیا کرو۔ دُکھ نہ کسی کو دیا کرو۔۔۔۔''

گولو ماؤتھ آرگن بجاتا رہا۔ پھر خود بخود۔۔۔ بلا ارادہ تانیا کی آواز
بھی اس میں شامل ہو گئی۔ ''جو دنیا کا مالک ہے' نام اسی کا لیا کرو۔۔۔'' تانیا کے
دونوں ہاتھوں میں ہیرو اور چالباز تھے اور وہ انہیں گیت کی لے پر جھلا رہی تھی۔
اس کے انداز میں بلا کا آہنگ تھا۔

پہلی بار تانیا کی سمجھ میں گولو کی بات آئی۔ موسیقی اور گیت بہت اہم

ہوتے ہیں۔ گیتوں کے بدلے آہیں اور موسیقی کے بدلے وجود کے اندر کے شعلے اور دُھواں قبول کرنا سراسر خسارے کا سودا ہے۔ اس کے اندر کی تمام نفرت دُھل گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ گیت جیسے اس کے سارے وجود میں گونجنے لگا۔ وہاں صرف گیت ہی نہیں تھا۔ گیت کی بازگشت بھی تھی۔ اس کے علاوہ آذر جیسے قابلِ نفرت انسان کے لیے اس کے وجود میں ایسے نازک جذبے مچل اُٹھے تھے، جن سے وہ اب تک ناواقف تھی۔ وہ اب بھی ان جذبوں کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھی۔

گولو جھومتا ہوا ماؤتھ آرگن بجاتا رہا اور وہ گاتی رہی۔ شیشہ ٹوٹ کے جُڑ سکتا ہے، دل نہ جڑے گر ٹوٹے۔ کتنا ہے بے درد وہ انسان، پیار کا گھر جو لوٹے۔ کام نہ ایسا کیا کرو، دُکھ نہ کسی کو دیا۔۔۔' اور ساری کائنات جیسے مسحور ہو کر ٹھہر گئی تھی۔

پھر اچانک گیت ختم ہو گیا۔ ماؤتھ آرگن کی آواز سناٹے میں گھل مل گئی لیکن تانیا کے نیم وا لبوں پر اب بھی وہ گیت بے آواز ہونے کے باوجود تھرک رہا تھا۔ فضا میں اس گیت کی گونج اب بھی موجود تھی۔ تانیا عقبی نشست پر دراز ہو گئی۔ اس نے ہیرو اور چالباز کو اپنے سینے سے لگا لیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن آنکھوں میں دور دور تک نیند کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دور گولو کے جلتے ہوئے سگریٹ کا سرا دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے گھپ اندھیرے میں اُمید کی ننھی سی کرن۔۔۔ ہر طرف بے حد تقدس آمیز خاموشی اور اندھیرا تھا۔ یہ تاثر تانیا کے لیے بے حد حیرت انگیز تھا۔

وہ کاری وار بھی آذر کے سینے میں بھڑکتی ہوئی نفرت کو نہیں بجھا سکا۔ اُسے

اس عورت سے بھی نفرت اور کراہیت محسوس ہونے لگی، جسے اس نے تانیا کی جگہ دی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے عورت کو بستر سے دھکیل دیا اور خاموش لیٹا چھت کو تکتا رہا۔ زیرِ لب گالیاں بکتا رہا۔ ان گالیوں کا ہدف کوئی شخص نہیں تھا۔ بلکہ تانیا کی معصومیت، شرافت اور سادگی تھی۔ وہ اتنے جتن کے باوجود اُسے اپنی سطح پر نہیں لا سکا تھا۔

اگلے روز زندگی اپنے تمام تر معمولات سمیت بیدار ہوئی۔ ہیرو، چالباز اور اُن کے ساتھی اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ اسٹال کے گرد بچے جمع ہو گئے تھے۔ پھر کٹھ پتلیوں کی دیکھ بھال اور ترجمانی کے لیے تانیا آئی۔۔۔ اور پتلی تماشا شروع ہو گیا۔

اس رات کے بعد بھی پتلی تماشے کا سفر بدستور جاری رہا۔ البتہ ایک تبدیلی ضرور رونما ہوئی۔ اب آذر جب بھی کسی ہوٹل میں ٹھہرتا تو ہمیشہ دو کمرے لیتا۔ تانیا الگ کمرے میں رہتی۔ صرف یہی نہیں، بلکہ وہ تانیا سے گریزاں رہنے لگا۔ اس کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ تانیا سے اس کا سامنا نہ ہو۔

بہر حال، پتلی تماشے کی کامیابی اور مقبولیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ جہاں بھی جاتے، لوگوں کے دل موہ لیتے۔ تانیا کی موجودگی پتلی تماشے کو ناظرین کے لیے محض پتلی تماشا نہیں رہنے دیتی تھی۔ دیکھنے والوں کو ایسا ہی لگتا، جیسے وہ پتلیاں نہیں، جیتے جاگتے انسان ہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے، وہ تماشا نہیں، حقیقت ہے۔ اس میں اس بات سے دلچسپی اور بڑھ جاتی کہ تماشا جس علاقے میں ہوتا، تمام پتلیاں وہاں کے لوگوں سے بخوبی واقف ہوتیں اور چالباز مقامی لوگوں کے متعلق افواہیں پھیلانے میں پیش پیش رہتا۔ لطف یہ کہ اس کی پھیلائی ہوئی ہر افواہ میں کسی نہ کسی حد تک صداقت بھی ہوتی۔

کبھی کبھی ہیرو سرگوشی میں پکارتا۔ ''اے چالباز اور تانیا، ذرا یہاں آؤ۔

مجھے ایک راز معلوم ہوا ہے لیکن خدا کے لیے۔۔۔خواتین کو نہ بتانا۔ یہ عورتیں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں۔ پندرہ منٹ کے اندر بات پورے شہر میں پھیل جائے گی۔۔۔''

تانیا لپک کر اس کے قریب جاتی۔ اس کی آنکھوں میں تجسس کی چمک ہوتی۔ ''راز کی بات۔ واہ' مزہ آ گیا ہیرو۔'' وہ ہیجانی لہجے میں کہتی۔ ''مجھے بہت اچھی لگتی ہیں ایسی باتیں۔ جلدی سے بتاؤ نا اور یقین کرو' میں کسی کو بھی نہیں بتاؤں گی۔''

چالباز کی آنکھوں میں عیاری کی چمک لہراتی اور وہ منہ بنا کر کہتا۔ ''یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ راز سُن کر مُنہ بند رکھا جائے۔ تم مجھے بتاؤ ہیرو۔ پھر میں سوچوں گا کہ اس راز کی کتنی قیمت وصول کی جائے اور کیسے کی جائے' اگر بلا قیمت ہو تو میں اسے حماقت تصور کرتا ہوں۔''

''نہیں نہیں چالباز۔ یہ راز ایسا نہیں ہے۔'' ہیرو کے لہجے میں احتجاج ہوتا۔ ''یہ ایسا راز نہیں ہے' جسے ہمیشہ راز رکھا جا سکے۔ بلکہ یہ تو چند روز بھی راز نہیں رہ سکے گا۔ وہ دیکھو۔'' وہ تماشائیوں کی طرف اشارہ کرتا۔ ''وہ جو پیچھے خاتون ہیں نا۔ ارے وہی' ہوٹل والے صابر کی بیگم۔ پتا ہے' وہ اپنے گھرانے میں اضافہ کرنے والی ہیں۔۔۔''

''تم گدھے ہو ہیرو۔ یہ راز کی بات ہے۔ ہُنہہ'' چالباز چیختا۔ ''ابے باؤلے' یہ راز تو ساری دنیا کو معلوم ہے۔''

''اے چالباز' خبردار۔'' تانیا ڈانٹتی۔ ''ایسی باتیں نہ کرو۔ تم لوگ بہت بدتمیز ہو گئے ہو۔ لوگوں کے ذاتی معاملات میں ٹانگ مت اُڑایا کرو۔''

اس دوران تماشائی اس مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ نومولود لڑکا ہو گا یا لڑکی۔ پروفیسر عقلمند اس سلسلے میں سائنسی دلائل پیش کرتا۔ بواتمیزن صابر کی بیوی کو مفت مشوروں سے نوازتی۔ رستم پیشکش کرتا کہ وہ بچے کی دیکھ بھال کے سلسلے میں بلا

معاوضہ مدد کرے گا۔ تماشائی بے حد خوش ہوتے۔ یہ تانیا کی شخصیت کا اعجاز تھا کہ ایک ہی بستی میں کئی بار تماشا دکھایا جاتا اور لوگ بار بار آتے اور خود بھی تماشے کا ایک حصہ بن جاتے۔ بچے بالخصوص تانیا سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ تانیا اُنہیں بتاتی کہ رستم بے ضرر آدمی ہے' تو وہ ڈرتے ڈرتے آتے اور رستم سے ہاتھ ملاتے۔ دو ایک جملوں کے تبادلے کے بعد اُنہیں رستم کے بے ضرر ہونے پر یقین آ جاتا اور وہ بے حد خوش ہوتے۔ تانیا اُنہیں چالباز اور ہیرو سے متعارف کراتی۔ وہ لوگ چالباز کو چھیڑتے اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتے اور ہیرو سے گپ شپ کرتے۔

لوگوں کے نزدیک وہ پتلی تماشا بے حد منفرد تھا۔ اس تماشے میں گھسے پٹے آئٹم نہیں ہوتے تھے بلکہ اس میں تخلیقی عنصر بے حد جاندار تھا۔ ہر بار نیا اسکرپٹ پیش کیا جاتا۔

ہنستی گاتی' کھلیتی کودتی اور مکالمے بولتی کٹھ پتلیوں کے درمیان جیتی جاگتی تانیا ان کے لیے بالکل نئی چیز تھی۔ جیسے جیسے پتلی تماشے والوں کا قافلہ بڑھتا گیا' ان کی شہرت اور مقبولیت شہر بھر میں پھیلتی گئی۔

اکتوبر کے دس دن انہوں نے ایک میلے میں گزارے۔ وہ بہت بڑا میلہ تھا اور متمول لوگوں کی بستی سے بہت قریب تھا۔ اسی لیے ان کی آمدنی میں بھی گراں قدر اضافہ ہوا۔ وہاں عجیب بات یہ ہوئی کہ لوگوں نے ابتدا میں پتلی تماشے کو کوئی اہمیت نہیں دی' بلکہ اسے فرسودہ سمجھ کر نظرانداز کرنا چاہا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ کچھ لوگ اسٹال کے پاس سے گزرتے ہوئے یونہی رُک گئے۔ اس کے بعد تماشے نے اُنہیں جکڑ لیا اور اُنہیں اختتام تک رُکنا پڑا۔ یوں دو دن کے اندر تماشے کی شہرت

جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

میلے کے آخری دن ایک فربہ اندام اور پچکی ہوئی ناک والا شخص اسٹال کی طرف آیا۔ اس نے آتے ہی گولو سے مطالبہ کیا کہ وہ تماشے کے مالک سے ملنا چاہتا ہے۔ اس وقت پورا پتلی گھرانہ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ریہرسل کی تیاریاں کر رہا تھا۔

''اے مسٹر' تم نے ملاقات کا وقت بھی لیا ہے۔؟'' ہیرو نے چیخ کر پوچھا۔

چالباز نے زوردار قہقہہ لگایا اور مضحکانہ انداز میں بولا۔ ''کیسی باتیں کرتے ہو۔ ملاقات کے لیے وقت لینے کے لیے بھی تو ملاقات ضروری ہے اور پھر یہ میرا شعبہ ہے۔ ہیرو۔۔۔تم آخر خود کو سمجھتے کیا ہو۔''

اسی وقت چمپا نمودار ہوئی۔ اس نے نووارد کا جائزہ لیا پھر وہ بولی تو اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ''اوہ۔۔۔ میں سمجھی تھی کہ کوئی خوبرو نوجوان ہوگا۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو چمپا۔'' بواتمیزن نے سخت لہجے میں کہا۔ ''خوبرو نوجوان نہ سہی' یہ مردِ رعنا دولت مند بہر حال ہے۔ ذرا دیکھو تو۔۔۔ اس کے جسم پر چربی کی کتنی تہیں چڑھی ہوئی ہیں۔ ایسی چربی ان لوگوں پر کبھی نہیں چڑھتی' جن کی جیبوں میں سوراخ ہوتے ہیں۔''

یہ بات طے تھی کہ فربہ اندام شخص پتلی گھرانے کے افراد پر کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑ سکا تھا۔ تانیا نے اس سلسلے میں نووارد سے معذرت کی۔ ''آج یہ لوگ شرارت کے موڈ میں ہیں۔ آپ ان کی باتوں کا بُرا نہ مانیے گا۔ خیر۔۔۔ یہ بتایئے' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''
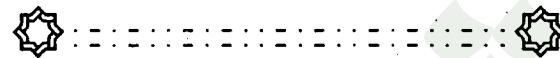
نووارد نے اپنا تعارف کرایا۔ اس کا نام افسر تھا اور وہ شہر کے ایک بڑے آڈیٹوریم کے لیے شو آئٹمز کی بکنگ کرتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اسی سلسلے میں

آیا ہے اور چاہتا ہے کہ پتلی گھرانے کے افراد آڈیٹوریم کے اسٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔

یہ سنتے ہی تمام پتلیوں میں ہیجان کی لہر سی دوڑ گئی۔ وہ بیک وقت مسرور اور فکر مند نظر آنے لگیں۔ مشوروں' جوابی مشوروں' منصوبہ بندی اور سوالات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ چالباز اسٹیج پر ہسٹیریائی انداز میں ناچتا پھر رہا تھا اور چیخ رہا تھا۔ ''دیکھو۔۔۔ مجھے دیکھو۔۔۔ میں اداکار بننے والا ہوں۔ بالآخر قوم کو میری صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑا۔ ہاہاہا۔۔۔ اور مسٹر افسر' سچ سچ بتاؤ' تمہیں یہ خیال میری کارکردگی دیکھ کر ہی آیا ہے نا۔ تانیا' تم نے سنا؟ اب ہم سب اسٹیج پر اداکاری کریں گے۔ میں رانجھے کا کردار ادا کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھو۔۔۔ میری ناک بھی رانجھے جیسی ہے۔''

افسر کے لیے وہ ایک نیا اور ناخوشگوار تجربہ تھا۔ راگی نے اس سے اس کا شناختی کارڈ اور دیگر کاغذات طلب کیے اور ان کا معائنہ کیا۔ پھر اسے بواتمیزن کی تقریر سننا پڑی' جس میں تھیٹر کے ماحول کو بُرا بھلا کہا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کا سامنا پروفیسر عقلمند اور ہیرو سے ہوا۔ ان تمام مرحلوں سے گزرتے گزرتے وہ اس بری طرح الجھا کہ پتلی گھرانے والوں سے مجوزہ معاوضے سے زیادہ معاوضے کا معاہدہ کر بیٹھا۔ اس کی آذر سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ معاہدے کے کاغذات مکمل ہوتے ہی' ہیرو نے کاغذات پر جھپٹا مارا اور اُنہیں اسٹیج سے نیچے لے گیا۔ جہاں آذر نے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ آذر کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد افسر نے تانیا کو کھانے کی دعوت دے ڈالی' کیونکہ وہ اسے بہت اچھی لگی تھی۔

اسی وقت چالباز اسٹیج پر نمودار ہوا اور کاؤنٹر پر کہنی ٹکا کر بڑے جارحانہ انداز سے اُسے گھورنے لگا۔ ''اے بڑے میاں' ہوش میں تو ہو۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تمہیں شرم نہیں آتی۔ تانیا کی عمر دیکھو اور ذرا خود کو دیکھو۔ کانوں پر

اتنے بڑے بڑے بال لٹک رہے ہیں اور چلے ہیں تانیا کو مدعو کرنے۔ سوچ سمجھ کر بات کرو ورنہ دماغ درست کردوں گا تمہارا۔''

دوسرے طرف سے بواتمیزن نے ہانک لگائی۔ ''اے ہے۔ میں تو پہلی ہی نظر میں تمہاری اصلیت سمجھ گئی تھی۔ میں نے راگی میاں کو بتایا تھا کہ تم نیت کے کھوٹے ہو۔ خیر۔۔۔ اس میں کوئی ہرج بھی نہیں لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تانیا کو دوگے کیا؟ ہیروں کے زیورات کا سیٹ دوگے؟ بنگلا دوگے۔''

''بکومت لالچی بُوا۔'' ہیرو نے بُوا کو ڈانٹ دیا۔ ''ہماری تانیا برائے فروخت نہیں ہے۔''

افسر نے کھسک لینے ہی میں اپنی عافیت جانی۔ وہ معاہدہ بغل میں دبا کر بھاگ لیا لیکن چالباز کے قہقے دور تک اُس کا تعاقب کرتے رہے۔

* * *

تھیٹر والوں سے معاہدہ تین ہفتے کا ہوا تھا۔ وہ عرصہ تانیا کے لیے زندگی کا خوشگوار ترین وقت تھا۔ پتلی گھرانے کے معمولات بدستور تھے۔ ہیرو اور راگی، ریہرسل کی نگرانی کرتے لیکن اس بڑی کامیابی نے آذر کو اور زیادہ تند خو اور تلخ بنا دیا تھا۔ یہ احساس اسے مارے ڈال رہا تھا کہ یہ سب کچھ تانیا کی وجہ سے ہے۔ اس اعتبار سے اسے تانیا کا ممنون ہونا چاہیے تھا لیکن اس نے ممنون ہونا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ ممنونیت کا وہ گھٹا ہوا احساس شدید نفرت کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

وجہ کچھ بھی رہی ہو' بہر حال' اُس نے اس بار نئے کھیل پیش کرنے کے بجائے وہ گھسے پٹے کھیل پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا جو اُس نے ابتدائی ایام میں پیش کیے تھے۔ اس کے باوجود پتلیوں کی کارکردگی بے حد اعلیٰ تھی اور اس اعتبار سے حیرت انگیز بھی کہ وہ ایسے کھیلوں میں حصہ لے رہے تھے' جن میں ان کی دلچسپی بہت پہلے ختم ہو چکی تھی۔ اگر کٹھ پتلیاں بھی جذبوں سے عبارت ہوتی ہیں' تو یقیناً ان کٹھ پتلیوں کی کارکردگی کسی توانا جذبے ہی کی مرہونِ منت تھی۔

ریہرسل ختم ہونے کے بعد وہ تانیا کے پیچھے پڑ جاتا اور اس کی کارکردگی پر ناروا تنقید کرتا۔ اس کی گفتگو اور لب و لہجے میں کیڑے نکالتا اور جب کچھ اور نہ بن پڑتا تو اس کی ظاہری شخصیت اور رنگ و روپ پر سفاکانہ تنقید کرتا۔ وہ بار بار اسے یاد دلاتا۔ ''میں نے تمہیں ذلت کے گندے نالے سے اُٹھایا۔ تم ڈفر لڑکی۔۔۔ تم آداب کب سیکھو گی۔ میں آخر کب تک تمہیں برداشت کروں گا۔'' وہ اس کی چال ڈھال' اس کے لباس اور آواز پر تنقید کرتا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اسٹیج پر تانیا کو بری طرح ناکام ہوتا دیکھنے کا خواہش مند ہے۔

لیکن اس سلسلے میں بھی اس کے حصے میں مایوسی ہی آئی۔ شاید اس لیے کہ وہ یہ بھول گیا تھا کہ اس کی تخلیق کردہ ساتوں کٹھ پتلیاں اپنی مرضی کی مالک ہیں اور ان کے اور تانیا کے درمیان محبت کا اٹوٹ رشتہ موجود ہے۔

جمعرات کی رات مفلس خان اور اس کا گھرانہ زندگی میں پہلی بار اسٹیج پر نمودار ہوا۔ آڈیٹوریم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شو شروع ہوا تو آذر کو شروع ہی میں اندازہ ہوگیا کہ تانیا اور اسکی دوست کٹھ پتلیوں نے اسکرپٹ بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ وہ سب بے ساختہ اداکاری کر رہے تھے۔ کھیل میں اسکرپٹ نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ اس کے باوجود ناظرین کھیل کے سحر میں جکڑے ہوئے تھے۔ چالباز' رانجھا بننے کی کوشش میں اُنہیں ہنسا رہا تھا۔ دوسری طرف رستم اتنے سارے تماشائیوں کی موجودگی میں دہشت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ بیس منٹ تک وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے اور تماشائیوں کے قہقہے اور تالیاں اُنہیں خراجِ تحسین پیش کرتی رہیں۔ ساری ریہرسل دھری رہ گئی۔ تانیا سمیت ہر کردار من مانی کر رہا تھا

اور وہ من مانی کامیاب بھی ثابت ہو رہی تھی۔ آذر پردے کے پیچھے اپنا سر پیٹنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا۔ اُس نے تانیا کے لیے ایک بے ہودہ لباس تجویز کیا تھا لیکن تانیا اسٹیج پر نمودار ہوئی تو اس نے انتہائی سادہ لباس پہنا ہوا تھا۔ دیہات کے سین کے پیش منظر میں وہ لباس نہایت موزوں نظر آ رہا تھا اور اس پر سج بھی رہا تھا۔

تمام کٹھ پتلیاں پہلی بار اسٹیج پر آنے کی وجہ سے بہت زیادہ خوش تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کی اس خوشی نے پورے آڈیٹوریم کو جگمگا دیا ہے۔ انہوں نے نت نئے لطیفے گھڑ کر سنائے۔ انہوں نے پس پردہ بیٹھے ہوئے آرکسٹرا والوں اور الیکٹریشنز کا مضحکہ اُڑایا جو تماشائیوں کے سامنے نہیں تھے۔ تانیا تماشائیوں کو ان لطیفوں کے پس منظر سے روشناس کراتی رہی۔ قہقہے لگتے رہے۔ تالیاں بجتی رہیں۔ پتلیوں نے اسپاٹ لائٹس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر ڈالی اور مختلف رنگوں کی اسپاٹ لائٹس طلب کرتی رہیں۔ غرض‘ اپنے پہلے ہی شو میں انہوں نے تمام روایات کو پامال کر ڈالا۔

ہمیشہ کی طرح اس روز بھی تانیا بھول گئی کہ وہ کون ہے اور اس وقت کہاں موجود ہے۔ وہ از خود رفتگی کی کیفیت میں تھی اور صرف اتنا جانتی تھی کہ اس کی سات سہیلیاں اس کے ساتھ ہیں اور اس کے سوا کہیں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کے انداز کی سچائی نے تماشائیوں کے دل چھو لیے۔ لیکن تماشائیوں کے دل تو صحیح معنوں میں رستم نے جیتے۔ وہ نمودار ہوا اور جیسے ہی اس نے تماشائیوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھی تو وہ دہشت کے مارے جیسے کسی سنگی بت کی طرح ساکت و صامت ہو گیا۔ وہ انداز اس قدر حقیقی تھا کہ ہال میں موجود ہر شخص دم بخود رہ گیا۔ تانیا نے اُسے جھنجوڑ کر ہلانے جُلانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ رستم شو کے اختتام تک اسی طرح ساکت رہا۔ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

پھر گولو اپنے ماؤتھ آرگن سمیت نمودار ہوا۔ ''موسیقی کو جادو قرار دیا

جاتا ہے۔'' اس نے اعلان کیا۔ ''ہم ابھی اس جادو کو آزماتے ہیں۔''

اس نے ماؤتھ آرگن مُنہ سے لگا لیا۔ مدھر موسیقی فضا میں گونجی اور تانیا کو وہ رات یاد آ گئی‘ جب گولو کے ماؤتھ آرگن نے اس کی ذلت اور دُکھ کا مداوا کیا تھا۔ اُس کے ہونٹ خود بخود ہلے اور پورا ہال گیت سے گونجنے لگا۔ ''اللہ ہی اللہ کیا کرو۔ دُکھ نہ کسی کو دیا کرو۔ جو دنیا کا مالک ہے۔۔۔'' پھر اس کی آواز میں آوازیں ملتی رہیں۔ تالیوں کی گونج بھی شامل ہوتی گئی۔ تماشائی بھی تماشے میں شامل ہو گئے تھے۔

گیت ختم ہونے کے بعد دیو قامت رستم نے سر اٹھایا۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں جنبش سی ہوئی۔ بالآخر اس نے اعلان کیا۔

''اے بے وقوفو۔۔۔ میں مجمع سے ڈرتا تھوڑا ہی ہوں۔ تم کیا جانو‘ میں بہت بڑا فنکار ہوں۔''

ہیرو نے اُچھل کر رستم کا سر تھپتھپایا اور پھر تانیا کا رخسار چوم لیا۔ ہال میں ایسی خاموشی تھی‘ جیسے لوگ پتلی تماشا نہیں بلکہ کسی معبد میں عبادت کا منظر دیکھ رہے ہوں۔ نہ جانے کتنے لوگوں کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

شو کے دوران اسٹیج کے دائیں طرف ایک خوش لباس اور خوشرو نوجوان کھڑا بڑے غور سے تماشا دیکھتا رہا تھا۔ اس کی نظریں تانیا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا نام جمال تھا اور وہ بازی گروں کے طائفے میں شامل تھا۔ پتلی تماشے کے بعد اس کے طائفے ہی کی باری تھی۔ طائفے کے دوسرے اراکین پتلی تماشے سے لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن جمال صرف اور صرف تانیا کو دیکھ رہا تھا۔ اس دبلی پتلی لڑکی نے اس کا دل جیت لیا تھا لیکن اُس کی ذہانت اسے ایک اور راستہ دکھا رہی تھی۔ اس تماشے نے اور بالخصوص تانیا کی کارکردگی نے اسے بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی جو تماشائیوں کو سانسیں روک کر بیٹھنے

پر مجبور کر سکتی ہے' اگر اس کے ساتھ شامل ہو جائے تو اس کا اپنا کرتب کس قدر
کامیاب ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ بہت بلندی پر تنی ہوئی رسی پر چلنے کا کرتب دکھاتا تھا
اس لڑکی کے شامل ہو جانے پر کرتب میں جان پڑ جاتی۔ وہ تصور میں لڑکی کو اپنی
طرف رومال اُچھالتے اور خود کو جھک کر وہ رومال پکڑتے دیکھ رہا تھا۔ پس منظر
میں تالیوں کا طوفان تھا۔

پھر تالیوں کی زبردست گونج میں پتلی تماشا اختتام کو پہنچا۔ تالیوں کی
گونج موج در موج تانیا کے وجود میں رقص کر رہی تھی۔ اس نے احتراماً ہر پتلی کا سر
خم کرایا۔ پردہ تماشے اور تماشائیوں کے درمیان حائل ہوا تو تماشائیوں نے اس
کی آخری جھلک دیکھی۔ وہ پتلیوں کے اسٹال کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ ایک
جانب سے ہیرو اور دوسری جانب سے چالباز اس کی گردن میں باہیں ڈالے کھڑا
تھا۔ ان دونوں نے اپنے اپنے رخسار تانیا کے رخسار سے لگا رکھے تھے۔ تانیا کی
آنکھوں میں ستارے اُترے ہوئے تھے۔ وہ زندگی میں اتنی خوش پہلے کبھی نہیں رہی
تھی۔

وہ اسٹیج سے اتر کر ڈریسنگ روم کی طرف بڑھی تو راستے میں جمال اس کا
منتظر تھا۔ ''ہیلو پیاری لڑکی۔'' اس نے محبت آمیز لہجے میں تانیا کو مخاطب کیا۔ ''میں
نے زندگی میں بے شمار ایکٹ دیکھے ہیں لیکن تمہارے ایکٹ نے مجھے بہت زیادہ
متاثر کیا ہے۔ پلیز۔۔۔ اب تم میرا کرتب دیکھنا اور یہیں ٹھہرنا۔ کرتب کے بعد میں
تم سے کچھ بات کروں گا۔''

تانیا نے اس کی نرم خوئی اور خوش اخلاقی کی وجہ سے اُس کی بات مان
لی۔ وہ اسٹیج کے پہلو میں کھڑی اس کا کرتب دیکھتی رہی۔ جمال نے ایک بار رسی پر
چلتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ تانیا نے بمشکل اپنی چیخ روکی
اسے ڈر لگا کہ جمال گر جائے گا۔

اسی وقت آذر اس کی طرف چلا آیا۔۔۔ نگاہوں میں بے مہری لیے۔
اس کے اپنے فن کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہاں اسٹیج منیجر کے سوا کوئی
اُسے پہچانتا نہیں تھا کہ پتلی تماشے کا کرتا دھرتا وہی ہے۔ وہ تانیا کے پاس رُکا اور
اس نے تانیا کی نگاہوں کے تعاقب میں جمال کو دیکھا۔ ''ہُنہہ۔۔۔ تیسرے درجے
کے بازی گر۔'' اس نے نفرت انگیز لہجے میں کہا اور تانیا کی طرف دیکھے بغیر آگے
بڑھ گیا۔ اس کا رُخ رقاصاؤں کے طائفے کی طرف تھا۔

جمال اپنے کرتب سے نمٹ کر نیچے آیا تو تانیا کو موجود پا کر بے حد خوش
ہوا۔ ''ہاں اچھی لڑکی! اب بتاؤ' کیا خیال ہے۔'' اس نے کہا۔

''واہ۔'' تانیا نے بے ساختہ کہا۔ ''مجھے تمہارا کرتب بہت پسند آیا۔ تمہیں
ڈر نہیں لگتا؟'' اس کے انداز میں بلا کی معصومیت تھی۔

''ڈر کیسا۔ عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔'' جمال نے جواب
دیا۔ ''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ تم میرا نیا کرتب دیکھنا۔ حیران رہ جاؤ گی۔''

'' پھر بھی یہ خطرناک ہے۔''

''اسی لیے تو لوگ اسے پسند کرتے ہیں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میرے
ساتھ چلو۔ میں تمہیں چائے پلاؤں۔''

تانیا کے چہرے پر خوف کا جو تاثر ابھرا' جمال اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''میں۔۔۔ میں۔۔۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔'' تانیا نے گڑ
بڑا کر کہا۔

''تو کیا وہ تمہارا شوہر ہے مفلس خان؟'' جمال نے تیزی سے حملہ کیا۔

تانیا نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا اور معصومیت سے بولی۔ ''نہیں تو۔''

جمال نے مزید تفتیش کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ''تم باہر چلو' میں لباس تبدیل کر
کے ابھی آتا ہوں۔'' اس نے کہا اور ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

تانیا چند لمحے وہیں کھڑی رہی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنا خوبصور
نوجوان اسی جیسی بدصورت لڑکی کو چائے پر مدعو کر سکتا ہے۔ دوسری طرف آذر نے
اُسے جس بندھن میں جکڑا تھا وہ اب اُس کے لیے عادت بن گیا تھا۔ اس کے علاوہ
وہ خود کو اُن ساتوں پتلیوں کا پابند سمجھتی تھی، جنہوں نے آڑے وقت میں اسے سہارا
دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے اس سلسلے میں ہیرو سے اجازت لینا چاہیے۔ تاہم اس
نے ڈریسنگ روم میں جا کر لباس تبدیل کیا۔ اس دوران وہ سوچتی رہی کہ جہاندیدہ
بوا تمیزن سے مشورہ کرنا نہایت مناسب رہے گا کہ ایک اجنبی کی دعوت اس طرح
قبول کرنا، نامناسب تو نہیں ہے لیکن وہ یہ سب سوچتی رہی اور اُس پر عمل کیے بغیر
باہر نکل آئی۔

باہر جمال اس کا منتظر تھا۔ جینز اور ہلکی جیکٹ میں وہ اور زیادہ خوبرو لگ
رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی کھل اُٹھا اور اس نے اتنی نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما، جیسے
وہ کانچ سے بھی نازک کوئی چیز ہو۔ تانیا کو مدّت سے ایسی نرمی اور ملائمت میسر نہیں
آئی تھی۔ مدّتوں بعد پہلی بار اسے خیال آیا کہ وہ ایک نوجوان لڑکی ہے اور زندگی
بے حد خوبصورت ہے۔ وہ بڑی بے پروائی سے ہنس دی۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے
کی کوشش بھی نہیں کی۔ ''اب ہم کہاں چلیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں جو تمہارے شایانِ شان ہو۔'' وہ ایک
ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ میزوں پر شمعیں روشن تھیں۔ مدّھم روشنی میں ریسٹورنٹ کا
ماحول بے حد خوابناک معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بڑی بے فکری سے اِدھر اُدھر کی
باتیں کرتے رہے۔ جمال کی نرم خوئی اور خوش گفتاری غیر محسوس طور پر تانیا کو متاثر
کرتی رہی۔ دونوں کی کم عمری بھی اُنہیں ایک دوسرے کی طرف کھینچ رہی تھی۔
زندگی میں پہلی بار تانیا زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اسے ایسا
لگ رہا تھا، جیسے کسی نے جادو کر کے اس رات کو کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ اس رات

آسمان پر کوئی ستارہ نہیں رہا تھا۔ سب کے سب اس کی آنکھوں میں اتر آئے تھے۔
وہ ان معصوم سی خوشیوں میں اس طرح الجھ گئی تھی کہ واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔
جمال، جسے اپنی وجاہت کا احساس تھا، اُسے لطیفے سُنا کر ہنساتا رہا۔ وہ جہاں گرد آدمی
تھا۔ اس کے پاس قصوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ پھر وہ اسے اپنے مستقبل کے
منصوبوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔

وہ اس وقت اُٹھے، جب ریسٹورنٹ کے بند ہونے کا وقت آ گیا۔ جمال
سرکس کے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور بے حد خوش اطوار تھا۔ وہ تانیا کے ساتھ
بے حد عزت اور تکریم سے پیش آ رہا تھا۔ اس نے تانیا کو اس ہوٹل کے دروازے پر
خدا حافظ کہا، جہاں تھیٹر والوں کی طرف سے ان لوگوں کو ٹھہرایا گیا تھا۔

ہوٹل کی لابی میں آذر تانیا کا منتظر تھا۔ وہ ایک کرسی میں دھنسا ہوا تھا اور
حسبِ معمول سگریٹ اس کے ہونٹوں کے درمیان جھول رہا تھا۔ خوش آئند بات یہ
تھی کہ وہ نشے میں نہیں تھا لیکن اس وقت وہ ہمیشہ سے زیادہ غصے میں لگ رہا تھا۔

''یہاں آؤ۔ کہاں مر گئی تھیں تم؟'' وہ غرایا۔ ''اب میں تمہیں تنخواہ دیا
کروں گا۔ چنانچہ تمہیں ادافروشی کی کوئی ضرورت نہیں۔''

تانیا کا چہرہ شرم سے تمتما اُٹھا۔ نفرت کا سیلاب اس شدّت سے اُمنڈا کہ
اسے لگا، بے ہوش ہو جائے گی۔ اتنے دنوں کے بعد تو اُسے ذرا سی آزادی ملی تھی۔
ان معصوم خوشیوں کی بازگشت اس کے وجود میں اب بھی لہرا رہی تھی، جن سے وہ
آج لطف اندوز ہوئی تھی۔ شاید یہ اسی بازگشت کا اعجاز تھا کہ وہ آذر کے سامنے تن
کر کھڑی ہو گئی۔ ''میں جمال کے ساتھ گئی تھی۔'' اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''وہ
مجھے چائے پلانے لے گیا تھا۔''

آذر نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ''اوہ۔۔۔ رات کے دو بج رہے ہیں۔ تم
اب تک صرف چائے پی رہی تھیں۔''

''تم جیسے ہو' ویسا ہی سوچو گے۔'' تانیا نے جواب دیا۔ ''لیکن جمال تم جیسا نہیں ہے۔ وہ بہت مہربان آدمی ہے۔''

آذر ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ غصّے اور نفرت سے مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے دانت پیستے ہوئے تانیا کی کلائی اتنے زور سے پکڑی کہ وہ چیخ اٹھی۔ ''بس۔۔۔ زیادہ بکواس مت کرو۔'' وہ دہاڑا۔ ''اگر آئندہ میں نے تمہیں اس کے ساتھ دیکھا تو میں تمہاری اور اس کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔ یہ بات یاد رکھنا اور بس' اب دفع ہو جاؤ۔''

اگلے روز تماشے کے دوران راگی نے تانیا کو ایک تحفہ پیش کیا۔ سینٹ کی ایک شیشی۔ یہ بات سب کے لیے حیرت انگیز تھی' کیونکہ راگی کنجوس تھا۔ اس سلسلے میں دیر تک چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ تانیا بہت خوش تھی۔ اس سے پہلے اسے کبھی سینٹ کی شیشی میسر نہیں آئی تھی۔ پھر فرمائش ہوئی کہ شیشی کھولی جائے۔ چنانچہ شیشی کھولی گئی۔ حسد کی ماری چمپا نے تقریباً آدھا سینٹ اپنے اوپر انڈیل لیا۔ بوا تمیزن نتھنے سکوڑتے ہوئے کہتی رہی۔ ''اللہ ماری۔۔۔ کیسی منحوس خوشبو ہے۔'' رستم نے اسے کوئی مشروب سمجھ کر پینے کی ناکام کوشش کر ڈالی۔ اس کے خیال میں خوشبو گواہی دے رہی تھی کہ اس مشروب کا ذائقہ بھی اچھا ہوگا۔

شو ختم ہونے کے بعد تانیا اسٹیج سے اتری تو جمال پھر اس کا منتظر تھا۔

''چائے پینے چلو گی نا؟'' اس نے پوچھا۔

تانیا نے خوفزدہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ ''نہیں۔۔۔ میں نہیں جا سکتی۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ وہ تمہیں مار ڈالے گا۔''

''اوہ۔۔۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔'' جمال کے نتھنے پھولنے پچکنے لگے۔ ''میں اپنی حفاظت کر سکتا ہوں۔ ضرور آنا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

''میں۔۔۔ میں وعدہ نہیں کرتی۔'' تانیا کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔

لیکن وہ مقررہ وقت پر آڈیٹوریم کے دروازے پر پہنچ گئی۔

وہ اس تمام وقت میں خود کو یقین دلاتی رہی تھی کہ آذر مداخلت نہیں کرے گا۔

نرم و مہربان رویے کی کشش اسے کھینچ رہی تھی۔ وہ وہاں پہنچی تو جمال کو اپنا منتظر پایا۔ اسی وقت ایک تاریک گوشے سے آذر برآمد ہوا اور ان دونوں کی طرف بڑھنے لگا۔

''خوب۔۔۔ بہت خوب۔'' آذر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تو تم دونوں کی کھال مسالہ مانگ رہی ہے۔ چلو' یہی سہی۔'' یہ کہہ کر اس نے تانیا کے رخسار پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔ تانیا قریبی دیوار سے ٹکرائی اور چکراتی ہوئی فرش پر بیٹھ گئی۔

''ذلیل عورت۔۔۔ میں تجھے زندگی کے آداب سکھا دوں گا۔'' وہ غرّایا۔

جمال تیزی سے آذر کی طرف بڑھا۔ آذر نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا۔ ''اور تم جاندار احمق' میں ابھی تمہاری خبر لیتا ہوں۔ تم آئندہ اس کے قریب آنا بھول جاؤ گے۔''

لیکن یہاں آذر غلطی پر تھا۔ جمال نہ تو بزدل تھا اور نہ ہی کمزور تھا۔ اس کا جسم فولادی تھا اور کلائیاں جیسے اسٹیل کی بنی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ لڑنے کے فن سے بھی آشنا ثابت ہو رہا تھا۔ ان کا تصادم مختصر ثابت ہوا۔ وہ دونوں خاموشی سے دیوانہ وار لڑتے رہے۔ ان کے ہاتھ پیر مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ صرف ان کے ہانپنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر اچانک لڑائی ختم ہو گئی۔

آذر گوشت میں لپٹے ہوئے ہڈیوں کے ڈھیر کی طرح فرش پر پڑا رہ گیا۔ وہ خود سے اٹھنے کے قابل بھی نہیں رہ گیا تھا۔ اس کی ناک اور مُنہ سے خون جاری تھا اور ایک آنکھ تقریباً بند ہو چکی تھی۔ جمال اس کے سر کے عین اوپر کھڑا بری طرح ہانپ رہا تھا۔
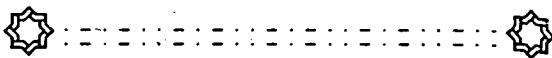
تانیا دیوار سے ٹکی کھڑی تھی۔ اس کا ہاتھ اپنے رخسار پر جما ہوا تھا۔ اس کی نظریں فرش پر ڈھیر آذر پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ نہ جانے کب سے' اُسے اِسی حال میں دیکھنے کی خواہش مند تھی۔ اس منظر کے لیے اس نے خدا سے دعائیں کی تھیں لیکن اب جبکہ اس کی دعائیں رنگ لائی تھیں' وہ خوش نہیں تھی۔ اس کا وجود کسی گہری اُداسی سے بھر گیا تھا۔ حلق میں کوئی گرہ سی اٹک رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ آنسو اس کی آنکھوں سے بہت قریب ہیں۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ شدت سے کی جانے والی خواہشیں پوری ہوں تو وجود کو اس قدر خالی خالی کر دیتی ہوں گی۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ نفرت کے ہدف کو جسمانی طور پر کچلا ہوا دیکھ کر آدمی رونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

جمال نے آگے بڑھ کر آذر کے پیٹ میں ٹھوکر ماری اور بولا۔ ''مزید پٹنا چاہتے ہو؟''

آذر کی دُھندلائی ہوئی آنکھوں میں شدید نفرت جھلکی۔ تاہم وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کچھ بڑبڑایا لیکن اس کا کہا ہوا کوئی لفظ سمجھ میں نہ آسکا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

''چلو تانیا۔'' جمال نے تانیا کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''آئندہ یہ تمہیں آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ میں لاتوں کے بھوتوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔''

وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چل دیے۔ تانیا نے ایک بار بھی پلٹ کر آذر کی طرف نہیں دیکھا۔ ریسٹورنٹ پہنچ کر وہ پہلے کی طرح ایک دوسرے میں اس طرح کھوئے کہ اُنہیں کسی اور بات کا ہوش نہیں رہا۔ تانیا کے ذہن پر چھائے ہوئے اُداسی کے بادل جمال کی دل آویز قربت کی وجہ سے چھٹ گئے۔ وہ تروتازہ ہو گئی۔ اس رات بھی وہ ریسٹورنٹ بند ہونے کے وقت اُٹھے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوٹل کی طرف چل دیے۔ سناٹے اور نیم تاریکی کا امتزاج ان دونوں ہی کو

بے حد رومان پرور محسوس ہو رہا تھا۔

اگلے روز کھیل کے آغاز میں ہیرو اسٹال کے اسٹیج پر نمودار ہوا تو اس کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی اور اس پر نیل بھی تھا۔ اس کے تمام ساتھیوں نے اُس سے دریافت کیا کہ اس آفت کی وجہِ نزول کیا ہے۔ ہیرو نے جواب دیا کہ وہ اندھیرے میں دروازے سے ٹکرا گیا تھا۔ اس پر سب نے چبھتے ہوئے سوال کیے۔ چالباز' ہیرو کا مضحکہ اُڑاتا رہا۔ اُسے جھوٹا قرار دیتا رہا لیکن ہیرو اپنے بیان پر ڈٹا رہا۔ بواتمیزن نے ہیرو کی آنکھ پر ٹکور کی۔ اس روز پتلی تماشے کا موضوع ہیرو کی آنکھ ہی رہا۔ اس تمام عرصے میں تانیا اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی' جو نہ جانے کیوں بری طرح آنکھوں میں اُمڈے آرہے تھے۔

تاہم اسٹیج سے اتر کر ڈریسنگ روم کی طرف بڑھتے ہوئے جمال نے اس کا ہاتھ تھام کر محبت آمیز انداز میں دبایا تو وہ جذبۂ تشکر محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

''آج ہم کلب چلیں گے۔۔۔ اور رقص کریں گے۔'' جمال نے سرگوشی میں کہا اور اسٹیج کی طرف بڑھ گیا۔

اس رات منیجر بھی آڈیٹوریم کے دروازے پر موجود تھا۔ اس نے خود کھڑے ہو کر دو سو کے لگ بھگ ایسے تماشائی گنے تھے' جو گزشتہ روز بھی پتلی تماشا دیکھنے آئے تھے۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ مفلس خان کا گھرانہ ہر روز نیا کھیل پیش کرتا تھا۔ ورنہ عام طور پر پتلی تماشے والے ایک ہی کھیل بار بار دکھاتے ہیں۔

معاہدے کا عرصہ ختم ہو رہا تھا۔۔۔ اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ پتلی تماشا وہاں کا مقبول ترین آئٹم ہے۔ چنانچہ آڈیٹوریم کی انتظامیہ نے آذر سے

مزید ایک ماہ کے لیے معاہدہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن پتلی تماشے کے علاوہ دوسرے تمام آئٹم تبدیل ہونا تھے۔۔۔اور اُن میں بازی گروں کا وہ طائفہ بھی شامل تھا جمال جس کا رکن تھا۔

معاہدہ ختم ہونے سے ایک ہفتہ پہلے جمال اور تانیا ریسٹورنٹ میں اپنی مخصوص میز پر موجود تھے کہ اچانک جمال نے تانیا سے پوچھا۔''مجھ سے شادی کرو گی؟''۔۔۔اور تانیا نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد اقرار میں سر ہلا دیا۔

''تم دیکھنا۔۔۔میرا نیا ایکٹ' جس میں تم بھی شامل ہو گی' مجھے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دے گا۔'' جمال نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔''تم بھی مشہور ہو جاؤ گی۔ پھر ہم ساری دُنیا گھومیں گے۔''

تانیا کو جمال کے خلوص' نرمی اور مہربان رویّے نے بے حد متاثر کیا تھا۔ اس نے جمال کے ساتھ جتنا عرصہ گزارا تھا' وہ بے حد خوشگوار تھا۔ زندگی میں اتنی خوش وہ کبھی نہیں رہی تھی۔ ان کے تعلق میں عجیب طرح کی سادگی تھی۔ اور وہ ہر ابہام سے پاک تھا۔ اس کے برعکس آذر سے اپنا تعلق اسے محض ایک ڈراؤنا خواب محسوس ہوتا تھا۔ تانیا کو پوری شدّت کے ساتھ اس بات کا احساس تھا کہ اس کی زندگی کے لیے یہی بہتر ہے کہ اب اس ڈراؤنے خواب کا خاتمہ ہو جائے۔ اپنے طور پر اسے یقین تھا کہ وہ بھی جمال سے محبت کرتی ہے۔ وہ نوجوان تھا۔۔۔خوبرو تھا۔۔۔اور مہربان تھا۔ کوئی لڑکی اس سے زیادہ اور کیا آرزو کر سکتی ہے۔

اس کے باوجود وہ آخری ہفتہ تانیا کے لیے بے حد صبر آزما تھا۔ اگرچہ جمال کے ہاتھوں مرمّت کے بعد آذر کبھی اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہوا تھا لیکن اس کے مزاج کی تلخی اور تندی میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ اس کی زبان اندر کا زہر اُگلنے والی پچکاری کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ وہ ریہرسل کے موقعوں پر آڈیٹوریم کے

ملازمین کے سامنے اسے بُری طرح لتاڑتا اور ذلیل کرتا۔ اس کے علاوہ اس کی حرکات کی پُراسراریت بھی بڑھ گئی تھی۔ بعض اوقات پورے پورے دن اُس کی صورت نظر نہ آتی۔ کبھی وہ پورے پورے دن اپنی زہریلی زبان سمیت اس کے سر پر مسلط رہتا۔ جب وہ غائب ہوتا تو مسلسل پردے کے پیچھے بیٹھا رہتا۔ چوکیدار نسیم کہا کرتا تھا کہ اس نے آدھی رات کے بعد پتلیوں کی آوازیں سُنی ہیں۔۔۔تند اور سخت لہجے' جیسے وہ کسی موضوع پر بحث کر رہی ہوں لیکن اسٹال کا اسٹیج خالی تھا۔ شاید وہ پتلیوں کی ذاتی گفتگو تھی۔

آذر نے تانیا کے شادی کے ارادے اور پتلی تماشے سے علیحدگی کی خبر بڑے سکون سے سُنی۔۔۔اور یہ بات حیرت انگیز تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اس بات کی توقع کر رہا تھا۔ یہ خبر سُنانے کے لیے جمال بھی تانیا کے ساتھ ہی گیا تھا۔ تانیا میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ تنہا اُس کا سامنا کرتی۔

آذر نے تانیا کا فیصلہ خاموشی سے سُنا۔۔۔اور بے پروائی کے انداز میں کندھے جھٹک کر پلٹا اور ڈریسنگ روم کی طرف چلا گیا۔ اس کے بعد آڈیٹوریم میں تانیا کی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ دانستہ تانیا سے اغماض برت رہا تھا۔

آذر نے تو تانیا کا فیصلہ بلاتبصرہ قبول کر لیا تھا لیکن ساتوں پتلیوں کے لیے اب اس کے سوا کوئی موضوع ہی نہیں رہا تھا۔ ہر روز تماشے کے دوران کھیل کا موضوع یہی رہتا۔ چنانچہ کھیل اب کھیل بالکل نہیں رہا تھا۔۔۔بلکہ حقیقت کا رُوپ دھار چکا تھا۔ تماشئیوں کا اپنا نکتۂ نظر بھی یہی تھا۔

تانیا کے اس رومانس اور شادی کے فیصلے پر ہر پتلی کا ردِّعمل اس کے اپنے مزاج اور کردار کے عین مطابق تھا۔ بواتمیزن کی نصیحتیں بامِ عروج پر پہنچ گئی تھیں۔ وہ تانیا کو زندگی کے متعلق اپنے تجربات کے حوالے سے بتاتی رہتی اور تماشائی بڑی دلچسپی اور سنجیدگی سے سُنتے رہتے۔ بواتمیزن کے لیکچر سے ان کی معلومات میں بھی

اضافہ ہوتا تھا۔

پتلیاں' تانیا سے طرح طرح کے سوالات کرتیں۔ مستقبل کے بارے میں اس کے ارادے کیا ہیں؟ وہ کہاں جائے گی؟ کہاں رہے گی؟ کیا کرے گی؟ شادی کہاں ہوگی؟ چمپا پوچھتی کہ زیورات اور کپڑے کیسے ہوں گے۔ میک اپ باکس بھی خریدا گیا ہے یا نہیں۔ پروفیسر عقلمند شادی کے حوالے سے نسلِ انسانی کے ارتقاء کی اہمیت اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈالتا۔ وراثت کی سائنس پر گفتگو کرتے ہوئے بتاتا کہ اولاد میں والدین کے اثرات کیوں نمایاں ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ بازی گروں کی اولاد میں کرتب دکھانے اور شاعروں کی اولاد میں شعر کہنے کی فطری صلاحیت کیوں ہوتی ہے۔ چالباز نے تانیا کو پیش کش کی کہ شادی کے موقع پر کھانے کی ذمے داری اسے سونپ دی جائے۔ رستم کا کہنا تھا کہ وہ بچوں کو کھلانے اور ہنسانے کی قدرتی صلاحیت رکھتا ہے۔۔۔ اور اس سلسلے میں اس کی خدمات تانیا اور اس کے ہونے والے بچوں کے لیے حاضر ہیں۔ یہ سن کر تانیا تو بیر بہوٹی کی طرح سُرخ ہوگئی' جب کہ پورا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔

اس معصوم اور مسرت آمیز تجسس کے باوجود تماشائی یہ بات محسوس کر رہے تھے کہ تمام پتلیاں تانیا کی جُدائی کے تصور سے دل گرفتہ اور نڈھال ہیں۔۔۔ لیکن اسے چھپانے کی بھرپور کوشش کر رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تماشائیوں کو بھی اُن پر بے ساختہ پیار آنے لگا تھا۔ تمام پتلیاں معصوم بچوں کی طرح عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہو رہی تھیں' جیسے تانیا اُن کے لیے تحفظ کی علامت رہی ہو۔

ہر آنے والے شو میں پتلیوں کا یہ دبا ہوا خوف نمایاں ہوتا گیا۔ اُن کے انداز میں نہ چھوڑ کے جانے کی ایسی التجا اور پکار شامل ہوتی گئی' جو تانیا کے دل کو چھو رہی تھی۔ وہ اپنا کردار ادا کرتے اور اسٹیج کے ایک گوشے میں دبک کر تانیا کو بڑی بے بس' محبوبانہ اور ملتجی نگاہوں سے تکتے رہتے۔ تانیا یہ سوچ کر اُلجھتی رہتی کہ

وہ اپنے ان ننھے منے ساتھیوں سے بچھڑ کر کیسے خوش رہ سکے گی۔ وہ پتلیاں چند لمحے یاس آمیز نگاہوں سے تانیا کو تکتی رہتیں۔۔۔ اور پھر آہِ سرد بھر کر غوطہ لگا جاتیں۔ آہستہ آہستہ یہ دباؤ تانیا کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا گیا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر لرزتی رہتی کہ جُدائی کے دن اس کا کیا حشر ہوگا۔ اس سلسلے میں تو جمال بھی اُس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔

تانیا کی شادی کے اعلان کے بعد تماشے کی مقبولیت میں اور اضافہ ہوگیا تھا۔ تماشائی تانیا کی شادی میں یُوں دلچسپی لے رہے تھے' جیسے وہ انہی کی کوئی بہن یا بیٹی ہو۔ قدرتی طور پر وہ تانیا کے حوالے سے جمال سے بھی تعلق محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ اب بازی گروں کے شو میں بھی رش ہونے لگا تھا۔ بالخصوص جمال کو بہت زیادہ داد دی جاتی تھی۔ جمال مُفت کی اس پبلسٹی سے بہت خوش تھا۔ تانیا کی وجہ سے وہ محبت کی ایک جیتی جاگتی داستان کا ہیرو بن گیا تھا۔ اخبارات اس کے اور تانیا کے تذکرے سے بھرے ہوتے تھے۔ بچہ بچہ اُن دونوں کے نام سے آشنا ہوگیا تھا لیکن اُسے ایک لمحے کے لیے بھی اندازہ نہ ہوا کہ تانیا پر کیا قیامت گزر رہی ہے۔

ہفتہ' 15 دسمبر کی رات تانیا کا آخری شو ہوا' جو تانیا کے لیے ناقابلِ فراموش ثابت ہوا۔ اس شو کے ٹکٹ ایک ہفتہ پہلے ہی بک چکے تھے۔ وہ شو دیکھنے کے لیے دوسرے قریبی شہروں سے بھی تماشائی آئے ہوئے تھے۔ ہال میں موجود آدھے سے زیادہ تماشائی وہ تھے جنہوں نے اب تک تانیا اور سات کٹھ پتلیوں کا کوئی شو نہیں چھوڑا تھا۔۔۔ جو تانیا اور اس کی سات سہیلیوں کی محبت میں پہلی نظر میں گرفتار ہوگئے تھے۔ اگلی نشستوں کے ٹکٹ مہنگے داموں خریدے گئے تھے۔ وہ سب لوگ ایسے تھے' جنہیں کہانی کے پس منظر میں ایک اور کہانی کی موجودگی نے مسحور کیا تھا۔ پس منظر کی اس کہانی میں محبت بھی تھی۔۔۔ ہجر کے امکان سے تپتے ہوئے پتلیوں کے بدن بھی تھے۔۔۔ اور دلوں کے ٹوٹنے کی صدائیں بھی۔

"کتنی عجیب بات ہے ڈیئر۔" اگلی نشست پر بیٹھا ہوا ایک نوجوان اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ "لڑکی کٹھ پتلیوں سے یوں باتیں کرتی ہے' جیسے وہ جیتی جاگتی ہستی ہوں۔ حالانکہ پس منظر میں یقیناً کوئی شاندار آدمی ہوگا۔۔۔ جسے اب تک ہم میں سے کسی نے نہیں دیکھا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ پسِ پردہ موجود وہ شخص تانیا سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے لیکن تانیا اس بازی گر سے شادی کر رہی ہے۔۔۔"

ہال میں موجود ہر شخص اسی انداز سے سوچ رہا تھا۔ پہلی بار وہ سب آذر کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوئے تھے۔

پروگرام' سوہنی دھرتی' سے شروع ہوا۔ پھر اسٹال کے اسٹیج کا پردہ اُٹھا تو دیہات کا چھوٹا سا سیٹ تماشائیوں کے سامنے تھا۔ گولو اپنے ماؤتھ آرگن سمیت نمودار ہوا۔۔۔ اور اُس نے اُس پر ایک لوک گیت سُنایا۔ پھر اچانک اسپاٹ لائٹس مدھم ہوگئیں۔ روشنی بڑھی تو اسٹیج پر ایک کٹھ پتلی نظر آئی۔۔۔ چالباز۔ چالباز نے بڑی محتاط نگاہوں سے اپنے دائیں بائیں اور پیچھے دیکھا۔ پھر اس نے سرگوشی میں پکارا۔ "شش۔۔۔ اے گولو۔" گولو اس کے قریب آیا تو اس نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ "یہ تانیا کہاں ہے؟"

"مجھے علم نہیں۔ کہو تو ڈھونڈ کر لاؤں۔" گولو نے جواب دیا۔

"جلدی سے لاؤ اسے۔ میں اسے کچھ دینا چاہتا ہوں۔" چالباز نے کہا اور اسٹیج کے نیچے غوطہ لگا گیا۔ وہ دوبارہ اُبھرا تو اس کے ہاتھ میں ایک بے حد خوبصورت کام دار سُرخ دوپٹہ تھا۔ اس نے دوپٹے کو کاؤنٹر پر پھیلایا اور بڑی محبت سے اُسے سہلاتے ہوئے گولو سے مخاطب ہوا۔ "یہ میں نے تانیا کے لیے خریدا ہے۔"

"واہ' بہت اچھا ہے۔" گولو نے بے ساختہ کہا۔ "لیکن یہ تو بہت مہنگا معلوم ہوتا ہے۔ میں ابھی تانیا کو ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔"

گولو ایک طرف چلا گیا۔ چالباز بدستور دوپٹے کو سہلاتا رہا۔ ایسا لگتا تھا' جیسے وہ اپنے ہاتھوں کے لمس سے دوپٹے کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ بڑبڑایا۔ "اب تو ہی تانیا کی آبرو کا محافظ ہے۔۔۔ اپنا رنگ کبھی نہ اُڑنے دینا۔۔۔ اپنے کسی ستارے کو کبھی ٹوٹنے نہ دینا۔"

اُسی وقت تالیوں کی زبردست گونج میں تانیا نمودار ہوئی۔ تالیاں کئی منٹ تک مسلسل بجتی رہیں۔ شاید وہ وداع ہوتی ہوئی دُلہن کا استقبال تھا۔ تانیا کا گلا رندھ گیا۔ مہربانی اور ستائش اب بھی اس کے لیے اجنبی چیزیں تھیں۔۔۔ اور جب بھی اس کا سامنا مہربانی سے ہوتا۔۔۔ یا اسے سراہا جاتا' اُس کا دل بھر آتا۔ اس وقت بھی اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ دیر تک وہ کچھ بول نہ سکی۔ بالآخر اُس نے خود کو سنبھالا۔ "اے چالباز۔۔۔ گولو کہہ رہا تھا کہ تم مجھے ڈھونڈ رہے ہو۔" اس نے کہا۔

"ہاں تانیا۔۔۔ اور مجھے خوشی ہے کہ تم باقی لوگوں سے پہلے یہاں آ گئیں۔ وہ۔۔۔ بات یہ ہے کہ مم۔۔۔ مم۔۔۔" چالباز سے جملہ پورا نہ کیا گیا۔ اُس نے دوپٹہ اپنے مُنہ میں دبا کر تانیا کی طرف بڑھایا۔ "یہ میری طرف سے تمہاری۔۔۔ شادی کا۔۔۔ تحفہ ہے۔۔۔ اسے میری الوداعی نشانی سمجھ لو۔" لڑکی کی آواز بھرّا گئی۔

تانیا کا ہاتھ تیزی سے اپنے دل کی طرف بڑھا۔ "بہت خوبصورت ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن چالباز۔۔۔ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ یہ بہت مہنگا ہے۔۔۔ اور میں جانتی ہوں کہ تمہارے پاس زیادہ پیسے۔۔۔"

چالباز کی آنکھوں میں عیاری کی چمک لہرا گئی۔

تانیا نے اُسے بغور دیکھا۔۔۔ اور یک لخت چوکنا نظر آنے لگی۔ "اوہ۔۔۔ اس میں بھی کوئی چکر ہے۔ یہاں آؤ۔۔۔ اور مجھے بتاؤ کہ تمہیں اتنا

قیمتی دوپٹہ کہاں سے ملا؟'' اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

چالباز نے مجرمانہ انداز میں سر جھکا لیا۔ ''کیا یہ ضروری ہے تانی۔''

''تم خوب جانتے ہو۔ میں نے ہزاروں بار تمہیں دیانت داری
اہمیت کے متعلق سمجھایا ہے۔۔۔۔''

چالباز نے ایک جھٹکے سے سر اُٹھا کر تانیا کو زخمی نگاہوں سے دیکھا۔ ا
کے انداز میں بلا کی معصومیت تھی۔ ''اگر تم جاننا ہی چاہتی ہو تو میں نہیں چھپاؤ
گا۔'' اُس نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''میں نے یہ دوپٹہ قسطوں پر خریدا ہے۔ اب ت
خوش ہو نا؟''

''ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن باقی قسطوں کا کیا ہوگا؟ اگر تم کسی مہینے ادائیگ
کر سکے تو پھر وہ لوگ میرے گھر آئیں گے اور مجھ سے یہ دوپٹہ چھین لیں گے۔''

''کس کی مجال ہے اتنی۔'' چالباز بپھر گیا۔ لیکن فوراً ہی نرم لہجے میں بو

''تم فکر نہ کرو۔ میں نے پکا معاہدہ کیا ہے۔ تم پر ذرا آنچ نہیں آئے گی۔''

اس وقت تک تانیا اس ایکٹ میں پوری طرح ڈوب چکی تھی۔ اب
اس کے لیے پتلی تماشا نہیں رہا تھا۔ ''کیسا معاہدہ؟ مجھے تفصیل سے بتاؤ۔'' اس
سنجیدگی سے پوچھا۔

''وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ بات یہ ہے کہ۔۔۔'' چالباز بُری طرح گڑبڑا
لیکن تانیا نے آنکھیں نکال کر اُسے دیکھا تو جلدی سے بولا۔ ''اگر میں کبھی مق
وقت پر قسط کی ادائیگی نہ کر سکا تو انہیں حق ہو گا کہ میری کھال اُتار کر ا
ایکسپورٹ کر دیں' جہاں اس سے کسی میم صاحب کے لیے کوٹ اور اسکارف ت
جائے گا۔ میں نے باقاعدہ معاہدے پر دستخط کیے ہیں۔''

ایسا لگا' جیسے تانیا کے دل میں کوئی پھانس دور تک اُتر گئی

''اوہ۔۔۔ پیارے چالباز۔۔۔ یہ تم نے کیا کیا؟ اتنی بڑی قربانی۔۔۔''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی چالباز نے دوپٹہ گھونگٹ کی طرح
اس کے سر پر ڈال دیا۔ ہر طرف دوپٹے میں جڑے ہوئے تاروں کی ضو بکھر گئی۔
تانیا نے محبت آمیز انداز میں چالباز کا ہاتھ تھاما۔۔۔ اور چالباز نے اس کے گلے
میں باہیں ڈال کر اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ انداز کسی ایسے شریر بچے کا سا تھا'
جو کسی بزرگ کی شفقت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہو۔

اُس وقت تانیا کے سینے میں موج در موج گداز لہریں لے رہا تھا۔ ایک
عیار اور شریر لومڑ۔۔۔ اور اس قدر محبت! دُنیا میں کوئی بھی شخص اس سے زیادہ کیا
طلب کر سکتا ہے۔ صرف اُسے خوش کرنے۔۔۔ خوش رکھنے کے لیے وہ اپنی فطرت
تک سے لڑ رہا تھا۔ یہ معجزہ صرف محبت ہی تو دکھا سکتی ہے۔

چالباز کے بعد یکے بعد دیگرے دُوسری پتلیاں اسٹیج پر نمودار ہوئیں۔
انہوں نے بھی تانیا کو خوشیاں دیں۔۔۔ لیکن میٹھے میٹھے دُکھ کے کانٹے بھی چبھوئے۔
وہ سب اُس کے لیے شادی کے تحفے لائی تھیں۔۔۔ اپنی اپنی بساط سے بڑھ کر۔
تانیا اُن کے خلوص میں بھیگ بھیگ گئی۔ وہ جدائی کی رات تھی۔

پروفیسر عقل مند اس کے لیے بے بی انسائیکلو پیڈیا لایا تھا۔ ''جو کچھ میں
جانتا ہوں' وہ اس میں موجود ہے۔'' اس نے کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
کہا۔ ''اور جو کچھ میں نہیں جانتا' وہ بھی اس میں موجود ہے۔ اس لحاظ سے یہ میرا نعم
البدل ہی نہیں' مجھ سے بہتر ثابت ہوگی۔ مجھے امید ہے' تمہیں کبھی میری کمی محسوس نہیں
ہوگی۔ لیکن میری دُعا ہے کہ تم کبھی کبھی مجھے یاد کرتی رہو۔''

چمپا نے تانیا کو ساڑھی پیش کی اور بڑی نیم دلی سے اس کی پیشانی کو چوما۔
بوائیزن نے پریشر ککر دیا۔ اور مشفقانہ لہجے میں بولی۔ ''یہ یاد رکھنا میری تانی کہ
مَردوں کے دل کا راستہ معدے سے گزرتا ہے۔ خوش ذائقہ کھانے پکاؤ اور اپنے
شوہر کا دل ہمیشہ کے لیے جیت لو۔ یہ بھی یاد رکھنا کہ بیشتر مَرد درندے ہوتے ہیں۔

انہیں سدھانا بہت ضروری ہوتا ہے۔'' اس کے بعد اس نے تانیا کو کچھ قیمتی مشورے بلا معاوضہ پیش کیے۔

راگی نے اسے ایک ایسا بیٹ پیش کیا' جو ایک تختہ کھسکانے سے ایک خوب صورت گڑیا میں تبدیل ہو جاتا تھا۔'' یہ تمہارے پہلے بچے کے لیے ہے۔'' اس نے شرماتے ہوئے کہا۔'' اگر لڑکا ہو تو اس بیٹ سے کرکٹ کھیلے گا۔۔۔ اور اگر لڑکی ہوئی تو اس گڑیا سے کھیلے گی۔۔۔ اس کی شادی کرے گی۔''

پھر گولو ہچکچاتے ہوئے آگے بڑھا۔ ہال میں موجود ہر شخص کی نظریں کریہ النظر' یک چشم گولو پر جمی ہوئی تھیں۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ اسپاٹ لائٹ کی روشنی میں گولو کے چہرے کے تمام عضلات شدتِ جذبات سے مرتعش نظر آرہے تھے۔ اس نے تانیا کی طرف ایک چھوٹی سی پتلی کتاب بڑھاتے ہوئے کہا۔'' تانی۔۔۔ میری بچی' میں غریب آدمی تجھے محبت کے گیتوں کے سوا کچھ بھی تو نہیں دے سکتا۔ یہ کتاب تجھے ہمیشہ یاد دلاتی رہے گی کہ دُنیا میں محبت سے بڑی کوئی چیز نہیں' جس نے محبت کھوئی' اس نے سب کچھ کھو دیا۔۔۔ خود کو بھی کھو دیا۔''

تانیا کا جسم بُری طرح لرز رہا تھا۔ نہ جانے کیسے اس نے اب تک اپنے آنسوؤں کو روک رکھا تھا۔ اس میں گولو کو دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔ اس نے گھبرا کر اسٹیج کے پہلو کی طرف دیکھا' جہاں بازی گروں اور رقاصاؤں کے طائفے کھڑے پتلی تماشا دیکھ رہے تھے۔ تماشائیوں کی طرح اُن کا بھی یہ حال تھا کہ جیسے وہ انسان نہیں' پتھر کے بے حس و حرکت بُت ہوں۔ ان میں جمال بھی تھا۔ کسرتی جسم والا دراز قامت نوجوان۔۔۔ لیکن اس لمحے وہ تانیا کو بہت اجنبی لگا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ جمال کو پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ وہاں موجود ہر شخص کا چہرہ بے تاثر تھا۔ صرف جمال ایسا تھا' جس کے چہرے پر مسرت کا بھرپور تاثر تھا۔۔۔ اور اس کی کھوئی کھوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ پتلی تماشا نہیں دیکھ رہا ہے۔ بلکہ انجانی دُنیاؤں کے

خوابوں میں گم ہے۔

پھر اسٹیج پر ہیرو نمودار ہوا۔ وہ بہت تھکا تھکا اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔۔۔ اور وہ خود کو مطمئن اور خوش و خرم ظاہر کرنے کے لیے سیٹی بجانے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔ کوشش یوں کہ سیٹی بجاتے بجاتے اچانک وہ بے سُرا ہو جاتا تھا۔ بالآخر اس نے وہ کوشش ترک کر دی اور بولا۔

'' کیا فائدہ خود کو اور دوسروں کو بے وقوف بنانے کا۔ میں تمہیں خدا حافظ کہنے آیا ہوں تانیا۔''

'' الوداع ہیرو ڈیئر۔'' تانیا نے اُداس لہجے میں کہا۔

'' تم میری کمی محسوس کرو گی؟''

'' ہاں ہیرو۔۔۔ تمام زندگی محسوس کروں گی۔''

'' اور تمہارے بچے بھی ہوں گے؟''

تانیا کا چہرہ تمتما اٹھا۔'' ہاں۔'' اُس نے آہستہ سے شرمیلے لہجے میں کہا۔

'' کیا وہ ہم جیسے ہوں گے۔''

'' کاش۔۔۔ کاش۔۔۔ ایسا ہی ہو۔۔۔ کاش۔۔۔ یہ بات میرے اختیار میں ہوتی۔''

ہیرو چند لمحے خاموش رہا' پھر بولا۔'' میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں لایا تانی۔۔۔ لا بھی نہیں سکتا۔ میں تمہیں وہ محبت دوں گا' جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گی۔۔۔ تمہاری پاسبانی کرے گی۔ تانیا میں۔''

تانیا کا گلا رُندھ گیا۔ آنسوؤں پر قابو پانا اور دشوار ہو گیا تھا۔

'' ہیرو۔۔۔ کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو؟'' اُس نے پوچھا۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا۔ کیوں کہ اتنے طویل عرصے کے دوران ہیرو نے ایک بار بھی اس سے محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ہیرو نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں۔۔۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس وقت سے کرتا ہوں' جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ خیر۔۔۔ اب تو بہت دیر ہوگئی۔ اب کیا ہوسکتا ہے۔ میں نہ جانے کیوں محبت کے اظہار سے ڈرتا ہوں۔ خیر' چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ' تم جاتے جاتے مجھے کوئی تحفہ دے سکتی ہو؟''

''یقیناً۔۔۔ جو تم کہو۔۔۔ بشرطیکہ میری بساط میں ہو۔'' تانیا کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔

''میرے ساتھ ایک گانا گاؤ۔''

''ضرور گاؤں گی۔ لیکن کون سا گانا؟''

''یہ تو تمہیں گولو بتائے گا۔''

گولو آگے بڑھا۔۔۔ اور اس نے ماؤتھ آرگن پر ایک جانی پہچانی دُھن چھیڑی۔

''اسے پہچانتی ہو نا؟ یہ محبت کا گیت ہے۔'' ہیرو نے آہستہ سے کہا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ تانیا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اگلے ہی لمحے دونوں کی آواز ہال میں گونجنے لگی۔۔ ''اللہ ہی اللہ کیا کرو۔ دُکھ نہ کسی کو دیا کرو۔۔۔'' وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گاتے رہے۔۔۔ ''شیشہ ٹوٹ کے جُڑ سکتا ہے' دل نہ جڑے گر ٹوٹے۔ کتنا ہے بے درد وہ انساں' پیار کا گھر جو لوٹے۔ کام نہ ایسا کیا کرو۔ دُکھ نہ کسی کو دیا کرو۔۔۔''

گیت ختم ہوتے ہی گولو ایک طرف چلا گیا۔ ہیرو نے جھک کر محبت سے تانیا کا رخسار چوم لیا اور بولا۔ ''تمہارے گھر کے آنگن میں تمہارے اپنے حسین پھول کھلیں' تو بھی ہمیں بھول نہ جانا۔ بلکہ انہیں دیکھ کر ہمیں یاد رکھنا۔۔۔'' پھر اس نے بڑی دل سوز آواز میں ایک مشہور نغمے کا ٹکڑا گنگنایا۔ ''مجھے دل سے نہ بھلانا۔۔۔'' اور غوطہ لگا کر اسٹیج سے غائب ہوگیا۔

فوراً ہی باقی پتلیاں دو' دو کی ٹولیوں کی شکل میں آئیں اور گاتی ہیں۔۔۔ ''ہمیں دل سے نہ بھلانا۔ چاہے روکے یہ زمانہ۔ تیرے بن میرا جیون کچھ نہیں۔۔۔'' یہ گیت ختم ہونے کے بعد تمام کٹھ پتلیوں نے تانیا کو محبت بھرے بوسوں میں بھگو دیا۔

اب پلکوں کا نازک بند آنسوؤں کے سیلاب کے سامنے جواب دے چکا تھا۔ آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود وہ کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھی' وہ بانہیں پھیلا کر رندھی ہوئی آواز میں چیخی۔ ''نہیں میرے پیارو' نہیں۔۔۔ میں تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی۔ میں ہمیشہ تمہیں اپنے بچوں کی طرح پیار کروں گی۔۔۔''

اسے پتا بھی نہ چلا کہ شو ختم ہو چکا ہے۔۔۔ پردہ گر چکا ہے۔ اس نے تو وہ تالیاں بھی نہیں سُنیں' جن میں تماشائیوں کی محبت تھی۔۔۔ احترام تھا۔۔۔ اور جنہوں نے آڈیٹوریم کے در و دیوار ہلا دیے تھے۔ اس نے جو آخری منظر دیکھا' وہ یہ تھا کہ جالبا اپنی تھوتنی آسمان کی طرف اُٹھائے دردناک آواز میں رو رہا تھا۔ رستم نے اپنا چہرہ اسٹیج کے پردوں میں چھپا لیا تھا۔۔۔ لیکن اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔

تانیا اسٹیج سے اندھا دُھند بھاگی۔۔۔ اور اس نے اپنے ڈریسنگ روم میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ پھر وہ دروازے سے پیشانی ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دروازے پر نہ جانے کتنے لوگوں نے دستکیں دیں' اُسے پکارا۔۔۔ لیکن اُس نے دروازہ نہ کھولا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا' جیسے آنسوؤں کے یہ جھرنے عمر بھر خشک نہیں ہوں گے۔

پھر جمال آیا۔ وہ اس سے دروازہ کھولنے کی التجائیں کرتا رہا۔ ''اس وقت مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔'' تانیا نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

"صبح میں تمہیں ہوٹل کے دروازے پر ملوں گی۔" جمال نہ چاہتے ہوئے بھی ا
ڈریسنگ روم میں چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔

وہ تاریک ڈریسنگ روم میں بہت دیر تک بیٹھی رہی۔ اس نے ر
کرنے کی زحمت بھی نہیں کی۔

دُنیا بھر میں ہر اسٹیج' شو ختم ہونے کے بعد' رات کے وقت بے حد وی
اور سنسان مقام ہوتا ہے۔ سعید آڈیٹوریم کے اسٹیج پر صرف زیرو کا ایک بلب
تھا۔ اس کا مقصد شاید صرف تاریکی کا احساس دلانا تھا۔ اسٹیج پر سیٹس کے ٹکڑ
بکھرے ہوئے تھے۔ عقبی دیوار کے پاس وہ اسٹال موجود تھا' جس کی پیشانی پر ط
خان اور اہل خانہ تحریر تھا۔

اسٹیج پر پھیلے ہوئے طویل سایوں کے درمیان گولو بیٹھا تھا۔ وہ ب
سوگوار تھا۔ برسوں پہلے وہ تکلیف اور اذیت کے ہر احساس سے عاری ہو چکا
اس لیے آج کا دُکھ اسے پہاڑ سا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اب وہ
محسوس کرنے کا عادی نہیں رہا تھا۔ اس وقت چار بجے تھے۔ ہر طرف تاریک
سناٹا تھا۔۔۔ لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔

تانیا اپنے ڈریسنگ روم سے نکلی۔ اس کے ہاتھ میں وہی پُرانا بیگ
جسے لے کر عرصہ پہلے وہ خود کو غرقِ سمندر کرنے کی نیت سے نکلی تھی۔۔۔ اور خدا
از راہِ مہربانی موت کے بجائے اسے سات دوستوں کی محبت سے نواز تھا۔
بیگ سے ہٹ کر صورتِ حال یکسر مختلف تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح دل شکس
تھی۔۔۔ اس کے علاوہ اِس بار اس بیگ میں پہلے سے زیادہ اور کہیں بہتر
موجود تھیں۔ دُکھی وہ اب بھی تھی' لیکن دُکھ کی نوعیت بدل چکی تھی۔ اسے یہ اد
بھی تھا کہ وہ اپنے پیچھے اپنی تانیا کا ایک حصہ چھوڑے جا رہی ہے' جو وہ تھی۔۔۔

جو وہ آئندہ نہیں ہو گی۔

دروازے تک پہنچنے کے لیے اسٹیج سے گزرنا ضروری تھی۔ اُس نے پہلو کی
جانب سے اسٹیج پر قدم رکھا' جہاں بہت مدھم روشنی تاریکی سے لڑنے کے بعد نزع
کے عالم سے دوچار محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بڑھتی رہی۔ پھر اچانک اس تاریکی میں
سے ایک سخت اور بھاری ہاتھ نکلا' جس نے اُس کی کلائی گرفت میں لے لی۔ اس
کے ساتھ ہی دوسرا ہاتھ سختی سے اُس کے منہ پر جم گیا۔ اسے چیخنے کا موقع ہی نہیں مل
سکا۔ اُسے ایسا لگا' جیسے خوف کے مارے اُس کے دل نے دھڑکنا موقوف کر دیا
ہے۔ اگر وہ ہاتھ آذر کا ہوتا تو شاید اُس کا دل واقعی بند ہو چکا ہوتا لیکن اس کی
اندھیرے سے ہم آہنگ ہوتی ہوئی بصارت نے صرف ایک آنکھ کی چمک محسوس
کی۔۔۔ اور وہ سمجھ گئی کہ اُسے گرفت میں لینے والا کون ہے۔

"خدا کے لیے' گڑیا۔۔۔ میری بچی' اپنی آواز نہ نکلنے دینا۔" اس کے
کانوں میں گولو کی سرگوشی گونجی۔

اس سناٹے میں تانیا کو اپنے دل کے دھڑکنے کے سوا کوئی آواز سُنائی نہیں
دے رہی تھی۔ گولو نے اُس کے منہ پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا تھا۔ "کیا بات ہے
گولو؟" اُس نے لرزیدہ آواز میں پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ یہاں کچھ ہو رہا ہے۔ تم یہیں
رُک جاؤ میرے پاس۔۔۔ لیکن آواز نہ نکلے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

تانیا کو گولو کے جسم کی لرزش واضح طور پر محسوس ہوئی۔ "لیکن گولو۔۔۔
ڈرنے کی کوئی وجہ بھی۔۔۔"

"شش تانی۔۔۔ بولو مت۔ صرف سُنو۔" گولو نے کہا اور نرمی سے اس
کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ابتدا میں اُس کی اپنی سانسوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ پھر کچھ گڑ

گڑاہٹ سی سُنائی دی۔ کچھ دیر بعد بصارت بھی سماعت کے ساتھ شامل ہو گئی۔ گولو نے اشارے کے طور پر تانیا کے ہاتھ پر خفیف سا دباؤ بڑھایا' کیوں کہ اسٹال کے اسٹیج پر ہیرو نمودار ہوا۔۔۔ اور اُس نے محتاط نگاہوں سے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ اُس کا وہ انداز بے حد خوفناک تھا۔۔۔ وہ احتیاط ناقابلِ فہم بھی تھی کیوں کہ اس وقت وہاں کسی کی موجودگی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ انداز اداکاری بھی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ کیوں کہ اداکاری تو تماشائیوں کے سامنے کی جاتی ہے۔ خالی ہال میں اداکاری کا کیا کام؟

''میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔'' گولو نے سرگوشی میں کہا۔ ''میں ان کی موجودگی محسوس کر رہا تھا۔''

اس بار تانیا نے اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''خاموش رہو گولو۔''

ہیرو گردوپیش کا جائزہ لے کر مطمئن ہو گیا اور اُسے یقین ہو گیا کہ وہاں کوئی ذی رُوح موجود نہیں ہے تو وہ اسٹال کے ایک گوشے کی طرف چلا گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھاما اور چند منٹ اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا۔ پھر ایک سرگوشی نے جیسے خاموشی کے شیشے کو چکنا چور کر دیا۔ ''ہیرو۔۔۔ یہ تم ہی ہو نا؟'' کس نے پوچھا۔

ہیرو نے سر اُٹھایا۔ ''ہاں۔۔۔ میں ہی ہوں۔'' اُس نے اُداس لہجے میں جواب دیا۔

''میدان صاف ہے؟''

''ہاں۔ یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔''

''چوکیدار کہاں ہے؟''

''سو چکا ہے۔''

اس جواب کے بعد لومڑ کا سر اُبھرا۔ وہ بھی چند لمحے گردوپیش کا جائزہ لیتا

رہا۔ پھر مطمئن ہونے کے بعد وہ ہیرو کے پاس چلا گیا۔

''ہاں' اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔'' اُس نے پوچھا۔

''اگر اس سوال کا جواب تم نہیں دے سکتے تو کوئی بھی نہیں دے سکتا۔'' ہیرو نے کہا۔

''نہیں۔۔۔ تم غلط کہہ رہے ہو۔ تم ہی سب سے زیادہ ذہین ہو۔ اس شو کو تم ہی چلا رہے ہو۔ یہ ساری خرابی تمہاری ہی پیدا کردہ ہے۔''

''میری؟'' ہیرو کے لہجے میں احتجاج تھا۔۔۔ لیکن فوراً ہی اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔ ''ممکن ہے لیکن میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تانیا اُس کرتب باز پر ریجھ جائے گی۔ وہ خودغرض آدمی تانیا کو کوئی خوشی نہیں دے سکے گا چالباز۔''

''تم نے اُسے سمجھایا کیوں نہیں؟''

''بوا تمیزن نے کوشش کی تھی۔۔۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تانیا بچی ہے۔ نہیں جانتی کہ جمال خودغرض آدمی ہے اور اسے اپنی شہرت کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔''

''تو ہیرو۔۔۔ کیا تانیا سچ مچ اُس سے شادی کر لے گی؟'' چالباز نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''بالکل کر لے گی۔ چالباز۔۔۔ ہماری دُنیا تو سمجھو کہ لُٹ چکی۔''

''مردود۔۔۔ ذلیل۔۔۔'' چالباز غرآیا۔

''نہیں چالباز' اپنی زبان خراب کرنے سے کیا فائدہ؟ تمہیں معلوم ہے کہ تانیا بدکلامی کو کس قدر ناپسند کرتی ہے۔ مسئلہ صرف اتنا ہے کہ ہمیں اپنے بارے میں فیصلہ کرنا ہے۔ زندہ رہنے سے کوئی فائدہ ہے؟''

''کم از کم میرے نزدیک تو نہیں ہے۔'' چالباز نے جلدی سے کہا۔

''میرے لیے تو تانیا ہی سب کچھ تھی۔ اب تو جینا مرنا برابر ہے۔''

''میں تم سے متفق ہوں۔ میرا خیال ہے۔ ووٹنگ کر لی جائے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم چیئر مین ہو۔۔۔ میں ذرا حاضری چیک کر لوں۔ ہاں بھئی رستم؟''

''میرا خیال ہے' میں یہاں موجود ہوں۔'' نیچے سے دیو قامت رستم کی آواز آئی۔

''راگی؟''

''حاضر جناب۔''

''چمپا؟''

''میں موجود ہوں۔''

''بواتمیزن؟''

''ہاں بھئی۔''

''پروفیسر عقل مند؟''

''میں کبھی غیر حاضر رہا ہوں؟''

''سب موجود ہیں۔'' چالباز نے اعلان کیا اور پیٹ پر ہاتھ باندھ لیے۔

ہیرو نے بڑی سنجیدگی سے صدارتی تقریر شروع کی۔ ''خواتین و حضرات! ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری محبوب بہن تانیا شادی کی غرض سے ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہے۔۔۔ اور اب کبھی لوٹ کر ہمارے پاس نہیں آئے گی۔ اس اجلاس کا مقصد یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اب کیا کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس سے بچھڑ کر بھی ہم زندہ رہیں گے۔''

''جب کوئی ہمیں دیکھنے ہی نہیں آئے گا تو پھر ہمارے وجود کا کیا فائدہ؟'' راگی نے اُلٹا سوال کر ڈالا۔

''جب وہی ہم میں نہیں رہی تو پھر بچا کیا؟'' چالباز نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''کیا فرق پڑتا ہے۔ ممکن ہے' ہمیں اس جیسا کوئی اور مل جائے۔'' چمپا بولی۔

رُستم نے کہا۔ ''میں بے وقوف اور کم عقل ہوں۔۔۔ لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ہمیں تانیا جیسا کوئی اور نہیں مل سکتا۔ اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔''

''لیکن تانیا کی آمد سے پہلے بھی ہم تماشا دکھاتے تھے۔'' بواتمیزن نے رائے زنی کی۔

''تو تم اپنی اوقات پر واپس جانا چاہتی ہو؟'' پروفیسر عقل مند نے اُس سے پوچھا۔ ''تباہ حالی کے وہ دن یاد بھی ہیں۔ بلندی کے بعد پستی کچھ اچھی نہیں لگتی۔''

''کچھ بھی ہو۔ ہمیں اپنی تقدیر پر شاکر رہنا ہوگا۔'' چمپا نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

''میرے خیال میں تو ہمیں بلندی اور پستی سے بے نیاز ہو جانا چاہیئے۔'' پروفیسر نے رائے دی۔

''وہ کیسے پروفیسر؟'' ہیرو نے پوچھا۔

''ترکِ وجود کے ذریعے۔'' پروفیسر نے مختصراً کہا۔

''اوہ۔۔۔ اوہ۔۔۔ میں سمجھا۔''

''ہاہاہا۔۔۔ کم از کم میرے لیے تو یہ حل قابلِ قبول ہے۔'' چالباز نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میں تانیا سے بچھڑ کر جینا نہیں چاہتا۔'' رستم نے کہا۔

''اکثریت کا یہی خیال ہے دوست۔'' چالباز نے کہا پھر ہیرو سے مخاطب ہوگیا۔ ''اب ووٹنگ ہو جائے جناب چیئر مین۔''

چند لمحے خاموشی رہی پھر ہیرو نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تو گویا ہم سب ترکِ وجود کے حق میں ہیں؟''

'ہاں' کا کورس سُنائی دیا۔ اسی میں ایک باریک سی 'نہیں' بھی تھی۔ وہ چمپا تھی۔

''تحریک پاس ہوگئی مسٹر چیئر مین۔ اب اسی پر عمل درآمد کیا جائے۔'' چالباز غرآیا۔

''لیکن طریقہ کار۔۔۔؟''

''مجھے خودکشی ہمیشہ سے اپیل کرتی رہی ہے۔'' راگی نے کہا۔ ''ہندوؤں میں ستی کی رسم' جس میں بیوہ خود کو نذرِ آتش کر دیتی ہے۔۔۔''

''دونوں باتوں میں کوئی ربط نہیں ہے۔ لیکن آئیڈیا بُرا نہیں ہے۔'' چالباز نے کہا۔

''اس کے لیے آڈیٹوریم کا عقبی حصّہ مناسب رہے گا۔'' ہیرو بولا۔

''لیکن۔۔۔ لیکن میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔'' چمپا نے چیخ کر کہا۔ چالباز نے تیزی سے غوطہ لگایا۔ چند لمحے بعد وہ ابھرا تو اُس کے ہاتھوں میں چمپا کی گردن تھی۔ چمپا کی آنکھیں حلقوں سے گویا باہر نکل آئی تھیں۔ زبان بھی باہر نکلی ہوئی تھی۔ چالباز نے بڑی بے پروائی سے چمپا کے بے جان جسم کو اسٹیج پر ڈال دیا۔۔۔۔۔۔ چمپا کے اسٹیج کے فرش پر گرنے کی ہلکی سی آواز بھی اس سناٹے میں دھماکے کی طرح گونجی۔

تانیا نے گہرا سانس لیتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''بے چاری چمپا۔۔''

چالباز نے فرش پر بکھری ہوئی' بے حس و حرکت چمپا کو دیکھا اور بہ آواز

بلند پوچھا۔ ''کوئی اور جو اس فیصلے سے انحراف کرنا چاہے؟''

''وہ مجھے کبھی اچھی نہیں لگی۔ بہت زیادہ اِتراتی تھی۔'' بواتمیزن نے چمپا کے بارے میں کہا۔

''لیکن تھی بہت خوبصورت۔'' رستم نے کہا۔

''دنیا کا سب سے بڑا فریب۔'' ہیرو نے تبصرہ کیا۔ ''سُنہرے بالوں والی شہزادی۔۔۔''

''سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا۔'' چالباز نے مُنہ بنا کر کہا۔ اُس نے چمپا کو کبھی پسند نہیں کیا تھا۔

''کسی کے ساتھ نامہربانی کا کبھی کوئی جواز نہیں ہوتا۔'' نیچے سے پروفیسر عقل مند کی آواز آئی۔ ''وہ جیسی بھی تھی' اُسے خالقِ کل' خدا تعالیٰ نے بنایا تھا' جس نے ہمیں بنایا ہے اور دُنیا کی ہر چیز بنائی ہے۔''

''اور جب ہم نہیں رہیں گے تو خدا کی خدائی کا کیا بنے گا؟'' رستم نے پُر تشویش لہجے میں پوچھا۔

''ہم تو کسی اور خدا کی خدائی میں شامل ہیں۔'' پروفیسر کا لہجہ تلخ تھا۔

''تب بھی۔۔۔ ہمارے خدا اور اُس کی خدائی کا کیا بنے گا؟'' رستم نے اصرار کیا۔

''شاید ہمارا خدا بھی خود کو تباہ کرلے گا۔۔۔ اپنی چھوٹی سی خدائی سمیت کیوں کہ ہم سب تو اس کے مختلف رنگوں کا عکس ہیں۔ ہم نہ ہوں گے تو وہ اپنی پہچان۔۔۔ اپنا اظہار بھی کھو بیٹھے گا۔''

''لیکن کیوں؟'' ہیرو نے پوچھا۔

''کیوں کہ خدا اپنی تخلیق کی ناکامی قبول نہیں کرسکتا۔''

''واہ۔۔۔ پروفیسر' تم واقعی عالم ہو۔ میں تو یہ بات سوچ بھی نہیں سکتا

تھا۔'' چالباز نے پُرستائش لہجے میں کہا۔

''علم کیا' علم کی بساط ہی کیا۔ جیسی جس کے گمان میں آئی ۔۔۔ اور گمان اس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔'' پروفیسر نے متفکرانہ انداز میں کہا۔

''خیر۔۔۔ تو بات صرف اتنی سی ہے کہ مفلس خان اور اہلِ خانہ اس دُنیا کو الوداع کہنے والے ہیں۔''

گولو نے سر گھما کر تانیا کو دیکھا۔ اس کی اکلوتی آنکھ فرطِ خوف سے پھیلی ہوئی تھی۔ ''تانیا بی بی۔۔۔ یہ لوگ مرنے والے ہیں۔'' اس کے لہجے میں دہشت تھی۔ ''انہیں مرنے نہ دو میری بچی۔۔۔''

اسٹیج پر چالباز' ہیرو کی طرف بڑھا اور اُس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''خدا حافظ دوست۔ تمہارے ساتھ یہ سفر بہت خوشگوار رہا۔۔۔ شکریہ۔''

ہیرو نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''خدا حافظ چالباز۔ تم ہمیشہ اچھے دوست ثابت ہوئے۔ اب میں نیچے چلتا ہوں تاکہ کوچ کی مکمل تیاری۔۔۔''

اُسی وقت تانیا اُٹھ کھڑی ہوئی لیکن مسلسل بیٹھے رہنے کی وجہ سے اُس کی ٹانگیں سُن ہو رہی تھیں۔ اُس نے گولو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سہارا لیا۔ اُس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ اور حلق بالکل خشک ہو رہا تھا۔ ٹانگوں کا دورانِ خون بحال ہونے کے بعد اُس نے اپنا بیگ اُٹھایا اور اسٹال کی طرف بڑھی۔ اسٹال سے کچھ فاصلے پر اُس نے اپنا بیگ اُچھال دیا تاکہ پتلیاں اُس کی آمد سے باخبر ہو جائیں۔

کتنی عجیب بات تھی۔ تانیا اور اُن پتلیوں کے درمیان زندگی اور موت کا تعلق تھا۔ تانیا کو وہ رات یاد آ گئی' جب وہ ان پتلیوں سے متعارف ہوئی تھی۔ یہ بھی ویسی ہی رات تھی۔ وہی مدھم روشنی۔۔۔ وہی طویل سائے۔۔۔ وہی پُراسرار اسٹال۔۔۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اُس رات تانیا موت کو گلے لگانے کی غرض سے

نکلی تھی اور پتلیوں نے مداخلت کی تھی۔۔۔ جب کہ آج رات تمام پتلیاں موت سے ہمکنار ہونا چاہتی تھیں اور تانیا کو اُنہیں بچانا تھا۔۔۔ حساب بے باق کرنا تھا۔

''ہیلو چالباز۔'' تانیا نے اسٹیج پر موجود چالباز کو پکارا' جو دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا تھا۔ بیگ پھینکنے کا دھماکا بھی اُس کے انہماک کو نہیں توڑ سکا تھا۔

چالباز اُس کی آواز سُن کر بُری طرح چونکا۔ اُس نے سر اُٹھا کر تانیا کو دیکھا۔ مدھم روشنی میں اُس کی آنکھوں میں حیرت سی جھلکی۔

''تانیا تم؟ تم یہاں کہاں؟ تم یہاں کب سے ہو؟'' اُس نے گڑبڑا کر پوچھا۔

''ان سوالات کا کیا فائدہ؟ مجھے معلوم ہے کہ تم لوگوں کے ارادے کیا ہیں۔'' تانیا نے کہا۔ ''آگ میں گوشت چاٹنے اور ہڈیاں گلانے والے شعلوں کے سوا تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ آخر میں صرف پچھتاوے کی راکھ بچے گی' جسے وقت کی تیز ہوا بکھیر دے گی۔ چالباز۔۔۔ تم نے میرا سر شرم سے جھکا دیا ہے۔''

''ہمیں علم نہیں تھا کہ تم یہاں موجود ہو اور پھر ہم نے جمہوری طریقہ۔۔۔''

''بس۔۔۔ جمہوریت کا نام نہ لو۔'' تانیا نے بھڑک کر کہا۔ ''تم نے لوگوں کے ساتھ زبردستی کی ہے۔''

''ممکن ہے۔۔۔ کیوں کہ میں' ہیرو اور پروفیسر بہت جذباتی ہو رہے تھے۔'' چالباز کے لہجے میں پشیمانی تھی۔ ''لیکن یہ سب کچھ صرف اس لیے ہو رہا ہے کہ تم ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہو۔۔۔''

''اور یہ چمپا؟''

'' چالباز نے سر جھکا لیا۔ اُس کے چہرے پر اعترافِ جرم تحریر تھا۔
''خوبصورت شمعیں بجھا دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔۔۔ سو ہم نے اسے بجھا دیا۔''

''ہم نے؟''

''ہم نے نہیں' میں نے۔'' چالباز کا لہجہ تند ہو گیا۔'' یہ تم سے محبت کر
کرتی تھی۔۔۔''

''تمہیں اس کا حق کس نے دیا؟''

''میں جانتا ہوں۔ مجھے اس کا حق نہیں تھا لیکن یہ مَری نہیں ہے۔ مرز
بے ہوش ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اجتماعی خودکشی کے موقع پر یہ مزاحمت کرے۔''
چالباز نے سر جھکا کر کہا۔ پھر محبت بھرے لہجے میں بولا۔'' پلیز تانیا۔۔۔ ہمیں چھو
کر نہ جاؤ۔''

''چالباز۔۔۔ تمہاری فطرت کبھی نہیں بدلے گی۔'' تانیا نے تھدہی
میں کہا۔۔۔ لیکن انداز میں محبت بھی تھی۔'' تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو۔۔۔ مج
کے ذریعے۔۔۔ ہمیشہ کی طرح۔''

''تانی۔۔۔ یقین کرو' اس بار یہ بلیک میلنگ نہیں ہے۔ اگر تمہیں جانا
ہے تو مجھے بھی ساتھ لے چلو۔''

''اور دوسروں کو چھوڑ جاؤں! چالباز' تم کتنے خود غرض ہو۔ ا
ساتھیوں کے ساتھ بے وفائی کرو گے۔''

چالباز' تانیا کے قریب آ گیا۔'' ضرور کروں گا۔ مجھے تمہارے سوا کس
پروا نہیں ہے تانی۔ مجھے ساتھ لے چلو۔۔۔ تم جانتی ہو کہ میں بے گھر ہوں
اور میں بچوں سے ہمیشہ محبت کرتا ہوں۔''

عادات پختہ ہوں تو انسان کو حال سے کاٹ کر رکھ دیتی ہیں۔ تانیا کو
طور پر یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ پتلی گھرانے سے اپنا تعلق توڑ چکی ہے۔ اُسے یہ
بھی نہیں رہا کہ وہ صبح طلوع ہو چکی ہے' جب اُسے ایک نئے اور خوشگوار سفر
ہے۔ اس نے بڑی محبت سے چالباز کا سر تھپکا اور بولی۔'' لیکن چالباز' یہ ب

ہے۔۔۔ اور بے وفائی نہایت بُری چیز ہے۔''

چالباز نے اپنی تھوتنی تانیا کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دی۔'' تانیا بی
بی۔۔۔ ایک سے وفا کے لیے ساری دنیا سے بے وفائی کرنا پڑے تو ایسی بے وفائی
کو کیا کہیں گے۔'' اس نے آہ بھر کے کہا۔'' ویسے بھی۔۔۔ مجھے تو کوئی اچھا نہیں
سمجھتا۔ میں اچھا ہوں بھی نہیں۔ مجھ سے تو توقع ہی بے وفائی کی رکھی جاتی ہے۔ سچ
پوچھو تو میں بھی اسی میں خوش ہوں۔ اچھی توقعات انسان کے لیے بہت بڑی ذمے
داری ثابت ہوتی ہیں۔ وہ ان پر پورا اترنے کے لیے بڑی اذیتیں اٹھاتا ہے۔
میں نے تمہارے لیے۔۔۔ تمہیں خوش کرنے کے لیے اچھا بننے کی کوشش کی۔۔۔
لیکن عادتوں سے لڑا جا سکتا ہے' فطرت سے نہیں۔ البتہ تم ساتھ ہو تو یقیناً مجھے ٹوکتی
رہو گی۔ اور میں پستیوں کی طرف پھسلنے سے محفوظ رہوں گا۔۔۔''

محبت میں بھیگی ہوئی بے بس تانیا چالباز کے سر کو محبت سے سہلانے کے سوا
کیا کر سکتی تھی۔'' میرے پیارے چالباز۔۔۔''

چالباز نے اس کے کندھے پر سر رکھ کر خاموشی سے کہا۔'' پلیز تانی۔۔۔
مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا۔۔۔ میرا خیال رکھنا۔''

اُس کا لمس ہمیشہ تانیا کو نئے جہانوں کی سیر کرا دیتا تھا۔ اس کا سینہ محبت
سے معمور ہو گیا۔ اس کے دل میں چالباز کے دُکھ درد لَو دے اُٹھے۔

اسی وقت رُستم اسٹیج پر اُبھرا۔'' اوہ۔۔۔ معاف کرنا تانیا۔ شاید میں مخل
ہوا ہوں۔'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ پھر جیسے اُسے کسی خیال نے چونکا
دیا۔ وہ اُچھل کر بولا۔'' اوہ۔ کیا تم واپس آ گئی ہو۔ خدا کا شکر ہے۔ تم واپس آ گئی
ہو تو میں اب مرنا ہرگز پسند نہیں کروں گا۔''

''لعنت ہے۔ تم ہمیشہ غلط موقع پر آ جاتے ہو۔'' چالباز غرایا۔

''لیکن رستم۔۔۔ میں کیسے ٹھہر سکتی ہوں۔ میری تو آج شادی ہونے والی

ہے لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ تم مر جاؤ۔ میں کیا کروں۔ اس مسئلے کا کوئی حل
ہے؟''
''مجھے اپنے ساتھ لے چلو تانیا۔ تم نہیں جانتیں کہ دیو قامت لیکن بے
وقوف ہونے کے کتنے نقصانات ہیں۔ خصوصاً اس صورت میں کہ میرا کوئی خیال
رکھنے والا نہیں۔۔۔ کوئی دوست نہیں' تمہارے سوا۔''
تانیا نے خود کو کہتے سنا۔ ''لیکن میں تو شادی کر رہی ہوں۔۔۔'' لیکن
ایسا ہی تھا' جیسے کوئی اور بول رہا ہو۔۔۔ اور کسی اور کے بارے میں بول رہا
ہو۔ اصل دنیا کون سی تھی؟ وہ جس میں وہ اس وقت موجود تھی۔۔۔ یا وہ' جہاں
جمال کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ اب اسے خیال آ رہا تھا کہ رستم کے بارے
کے متعلق وہ کس قدر ہمدردانہ انداز میں سوچتی آئی ہے۔
''رستم۔۔۔ تم ہرگز بے وقوف نہیں ہو۔'' تانیا نے احتجاج کیا۔ ''بات
صرف اتنی ہے کہ تم بونوں کی دنیا میں دیو کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہو۔ لوگ اپنے
سے برتر کو کمتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔''
''واہ۔۔۔ کتنی اچھی اور سچی بات کہی ہے تم نے۔'' نیچے سے راگی نے
نعرہ لگایا۔ پھر وہ اوپر آ گیا۔ ''یہی کچھ تو میرے ساتھ ہوا ہے۔ بڑے بڑے
موسیقار مجھ سے چڑتے ہیں۔ اور ہاں تانیا۔۔۔ تمہاری واپسی میرے لیے باعث
صد مسرت ہے۔۔۔ تمام تر خود غرضیوں کے ساتھ۔۔۔ کیوں کہ اب میں
سے بچ جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ پھر نیچے غوطہ لگا گیا۔
اسی وقت ہیرو سیٹی پر سوہنی دھرتی کی دھن بجاتا ہوا اسٹیج پر نمودار ہوا
اُس نے تانیا کو بدستور کھڑے دیکھا تو حیران نظر آنے لگا۔ ''ارے تانیا۔۔۔
ابھی تک موجود ہو۔ گئیں نہیں؟''
''میں جا ہی رہی تھی ہیرو' ذرا یہاں آؤ۔''

ہیرو تانیا کی طرف بڑھا۔۔۔ لیکن انداز ایسا تھا' جیسے کسی بھی لمحے بھاگ
کھڑا ہو گا۔
''میں نے اتفاق سے سب کچھ سن لیا تھا۔ ہیرو۔۔۔ جو کچھ ہوا' تمہیں
اس پر شرمندگی نہیں ہے؟''
''اوہ۔'' ہیرو نے بے ساختہ کہا۔ اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر
بولا۔ ''تمہارے بغیر ہم میں سے کوئی بھی ہوش مند نہیں تھا تانیا۔ شروع میں تو میں
سمجھا تھا کہ تمہارے بغیر بھی میں نگر نگر گھوم کر لطف اندوز ہو سکوں گا لیکن بعد میں مجھ پر
حقیقت کھل گئی۔ میں تم پر تکیہ کرنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ تم ہمیشہ مجھے سہارا دیتی
رہی ہو۔۔۔ نصیحتیں کرتی رہی ہو۔''
''اوہ ہیرو' نہیں۔ میں نے تو ہمیشہ یہی کوشش کی کہ تمہارے کاموں میں
مداخلت نہ کروں۔''
''تمہیں شاید اس کا اندازہ بھی نہیں ہو گا۔ تم مجھے آگے بڑھنے کی۔۔۔
اُڑنے کی ترغیب دیتی رہی ہو۔''
تانیا کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں۔ ''بے شک۔۔۔ تم اونچی
چھلانگ لگا سکتے ہو۔ آسمان کے تمام ستارے تمہارے دامن میں بھر سکتے ہیں۔۔۔
اور۔۔۔ اور۔۔۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔''
''لیکن میں اُڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے ستاروں کی آرزو بھی نہیں ہے۔'' ہیرو
نے چیخ کر کہا۔ ''میں تو صرف تمہارا ساتھ چاہتا ہوں۔ تانیا' مجھے اپنے ساتھ لے
چلو۔'' اس نے اپنا سر تانیا کے سینے پر رکھ دیا۔
''ہیرو۔۔۔ پیارے ہیرو۔۔۔ میں تو پہلے ہی دن سے تمہیں پیار کرتی
رہی ہوں۔'' تانیا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
ہیرو نے سر اُٹھا کر اُسے بغور دیکھا۔ ''نہیں۔۔۔ تم نے کبھی ہم سے محبت

نہیں کی۔ ورنہ تم ہمیں چھوڑ کر جانے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔''

اس جملے نے جیسے تانیا کا دل چھید ڈالا۔ ''میں تم سے محبت کر
ہوں۔۔۔ تم سب سے محبت کرتی ہوں۔۔۔ پوری سچائی اور شدت کے ساتھ
لیکن مجھے اُس سے نفرت ہے۔۔۔ اتنی شدید نفرت ہے کہ ہر محبت اس کے سا
دب جاتی ہے۔ میں کیا کروں۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ اُس نے آڈیٹوریم
خالی نشستوں کو دیکھا۔۔۔ سنسان اسٹیج کو دیکھا۔۔۔ پھر اُس نے وہ سچ اُگلا جس
اظہار وہ صرف ان کٹھ پتلیوں کے سامنے کرسکتی تھی۔ کسی انسان کے سامنے
اظہار کی اس میں جرأت نہیں تھی۔ ''میں اس سے محبت کرتی تھی۔ میں پہلی ہی نظر
اُس سے محبت کی گنہگار ہوبیٹھی تھی۔'' اُس نے تند لہجے میں کہا۔ ''میں اُسے
چاہتی تھی کہ اس کے لیے کچھ بھی کرسکتی تھی۔۔۔ سب کچھ قربان کرسکتی تھی۔۔۔ ل
اس نے میری محبت کے جواب میں تلخی اور شیطنت کے سوا کچھ نہیں دیا۔ میں اس
لیے راتوں کو جاگتی اور کڑھتی رہی۔۔۔ اُسے خوش کرنے کے انداز
رہی۔۔۔ میں نے اسے کیسے کیسے تحفے پیش کیے۔۔۔ لیکن اس کے رویے نے
محبت کو نفرت میں بدل ڈالا۔ جیسے جیسے وہ نفرت بڑھتی گئی' تمہارے لیے میری
بھی شدید ہوتی گئی۔ اتنی شدید محبت اور نفرت آخر کب تک ایک ساتھ قدم
چل سکتی ہے۔ ہیرو۔۔۔ ایسے میں تو انسان چیخ کر ٹوٹ جائے۔۔۔ پاگل
جائے۔ ہیرو۔۔۔ میرے ہیرو۔۔۔ مجھے جانے دو۔۔۔'' لیکن الفاظ کے
ہیرو کے کندھوں پر اس کے ہاتھوں کی گرفت اور سخت۔۔۔ اور گداز ہوگئی تھی
چالباز بھی اسی طرف چلا آیا۔ وہ بھی تانیا سے لپٹ گیا۔ ان معصوم کٹھ پتلیوں
معصوم لمس نے تانیا کو یوں رُلایا کہ اسے ایسا لگا' وہ آنسو بن کر بہہ جائے گی
اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔

پھر اچانک اسے ہیرو کی باریک آواز نے چونکا دیا۔ ''لیکن تانیا

ہم۔۔۔ میرا مطلب ہے' میں اور میرے ساتھی کون ہیں؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ پھر یہی
سوال چالباز نے پوچھا۔ اور جب تانیا نے آنکھیں کھولیں تو وہ دونوں اسٹیج سے جا
چکے تھے۔ البتہ پروفیسر عقل مند وہاں موجود تھا۔ عینک کے عقب سے اس کی آنکھیں
تانیا کو اپنے وجود میں اُترتی محسوس ہورہی تھیں۔

اتنے عرصے کے تعلق میں پروفیسر کا قرب تانیا کے لیے سکون اور
اطمینان کی علامت بن چکا تھا۔ وہ فلسفی تھا۔۔۔ ایسا دوست تھا' جس پر انحصار کیا جا
سکتا تھا۔ وہ ٹوٹے ہوئے کھلونوں اور دلوں کا سرجن تھا۔ چنانچہ تانیا عادتاً پرسکون
ہوگئی۔ لیکن وہ تو وہی سوال پوچھ رہا تھا۔

''پیاری تانیا۔۔۔ آخر ہم لوگ کون ہیں۔۔۔ ہیرو' چالباز' چمپا'
بواتمیزن' راگی' رستم اور میں خود۔ بتاؤ' ہم کون ہیں؟ ہمارا حوالہ کیا ہے؟''

تانیا کا بدن ہولے ہولے لرزنے لگا۔ اُسے ایسا لگا' جیسے وہ بے ہوش ہو
جائے گی۔ اُس نے سہارے کے لیے اسٹال کا کونا تھام لیا۔ اِردگرد کی دیواریں گر
رہی تھیں۔ وہ تمام دفاعی حصار لرز رہے تھے' جن کے پیچھے اُس نے زندگی کی پناہ
گاہیں تعمیر کی تھیں۔۔۔ جہاں تحفظ تھا۔۔۔ بے خبری اور خودفریبی تھی۔

واقعی' وہ لوگ کون تھے' کیا تھے؟ وہ کیسا جادو تھا' جس نے اُنہیں الگ
الگ رکھا تھا۔ اُن ساتوں کو جو ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھے' اپنی محبت اور نرمی
کے باوجود۔۔۔ لیکن جو ایک شیطان صفت شخص سے منسوب تھے۔ اس جادو کے
پیچھے کون تھا۔۔۔ کون تھا اس پردۂ زنگاری میں؟

''ذرا سوچو تو تانیا' وہ کس کا ہاتھ تھا' جسے بڑی محبت سے تھام کر تم زخم لی
کے آنسوؤں سے بھگوتی رہی تھیں۔۔۔ ہیرو کا تھا' چالباز کا تھا یا رُستم کا تھا؟''

تانیا کے حلق سے دہشت بھری چیخ نکل گئی۔ ''اوہ۔۔۔ وہ تو وہ ہاتھ تھا'
جو تھپڑ بن کر میرے مُنہ پر پڑا تھا اور اُنگلیوں کے نشان ثبت کرگیا تھا۔۔۔ شاید اُن

اذیتوں کی یادیں' جو اُٹھائی تو اُس نے تھیں' لیکن جن کے لیے آنسو میں نے بہائے تھے۔''

''ہاں تانیا۔۔۔ اور تمہیں اس ہاتھ سے محبت تھی۔ اس ہاتھ نے تمہیں سہارا دیا تھا۔ اور ہیرو' چالباز اور رُستم کے روپ میں بارہا تمہارے دکھوں کو تھپکیاں دیں۔۔۔''

تانیا کو اپنے ہوش و حواس ساتھ چھوڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کے باوجود اس بار سوال اس نے کیا۔ ''پروفیسر۔۔۔ تم ہی بتاؤ کہ تم لوگ کون ہو۔۔۔ اور تمہارا حوالہ کیا ہے؟''

پروفیسر کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ پھر وہ چند لمحے بعد گویا ہوا۔ ''انسان ہمہ رنگ ہمہ جہت ہوتا ہے گڑیا۔ وہ بیک وقت بہت کچھ ہوتا ہے۔ شعر کہنے اور ستاروں کی طلب کرنے والا ہیرو بننا چاہتا ہے۔۔۔ لیکن اندر سے رُستم کی طرح بے وقوف ہوتا ہے۔ اس میں حسد' رقابت' لالچ اور خود نمائی کا عنصر ہوتا ہے' چمپا کی طرح۔ وہ راگی کی طرح موسیقی کا رسیا ہوتا ہے تو بواتمیزن کی طرح افواہیں پھیلانے کا شوقین اور دوسروں کو اپنے مشوروں سے نواز کر اپنی اہمیت جتانے کا خواہاں ہوتا ہے۔ حصولِ علم اور مطالعے کا شوق اور دلیل اور منطق کا چسکا میرا طرح ہوگا تو یہ بات بھی یقینی ہے کہ ایسے شخص میں ایک ذہین اور عیار چالباز بھی موجود ہوگا۔ جو لوگوں کو فریب دینے پر مجبور بھی ہوگا۔۔۔ اور اس سے اسے خوشی بھی ہوتی ہوگی۔

''انسان اپنے وجود میں ایک چیستان ہوتا ہے بے بی۔'' پروفیسر نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''وہ کبھی حل نہ ہونے والا معما ہوتا ہے بی بی۔ اب ہم ساتوں کو لو' جن سے تمہیں محبت ہے۔ ہم ایک ہی ہستی کے سات پوشیدہ روپ ہیں۔ دوسری طرف ہم میں سے ہر ایک نے اپنے وجود کا ایک حصہ۔۔۔ اپنا دل تمہیں دیا

ہے۔ چالباز جیسا خود غرض شخص بھی تمہارے لیے اپنی کھال تک اتروانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ تم نہیں سمجھتیں۔۔۔ وہ درحقیقت اُس کی زبانی' اُس کے خالق کا پیغام تھا تمہارے لیے۔۔۔''

''نہیں۔۔۔ خدا کے لیے' خاموش ہو جاؤ۔'' تانیا دونوں کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس کر چیخی۔

''برائی بھی تو اچھائی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔'' پروفیسر نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ لیکن اُس کی آواز بدل گئی۔ وہ کسی اور کی آواز تھی۔ ''تم چلی جاؤ گی تو ہم میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہیں رہے گا۔''

''یہ کون ہے؟ کون بول رہا ہے؟'' تانیا چیخی اور پھر بلا ارادہ وہ اسٹال کے نچلے پردے کی طرف جھپٹی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اس پردے کے پیچھے کوئی حرکت نہیں تھی۔ وہاں سے اُسے دیکھا جا سکتا تھا لیکن وہ خود اس پردے کے پار نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اُس نے وہ پردہ نوچ ڈالا' جس نے نہ جانے کب سے اُسے اُس کچلے ہوئے اور ناخوش آدمی سے دُور کر رکھا تھا' جس سے وہ محبت کرتی تھی۔

وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت و صامت تھا۔۔۔ سُتا ہوا چہرہ' آنکھوں کے گرد گھرے سیاہ حلقے۔ لیکن اس سُتے ہوئے چہرے پر' اُن حلقہ زدہ آنکھوں میں سختی تھی۔۔۔ تلخی تھی' برہمی تھی۔ وہ سمجھوتا کرنے کا قائل نہیں تھا۔۔۔ لیکن وہ اُس کی محبت کے لیے مَرا بھی جا رہا تھا۔ مردہ چہرے اور زندہ آنکھوں والے اس شخص کا دایاں ہاتھ اٹھا ہوا تھا۔۔۔ اور اس میں وہ ڈوری تھی' جس کے دوسرے سرے پر پروفیسر عقل مند اُس کے اشاروں پر ناچ رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں وہ پتلی تھی' جسے تانیا' چالباز کے نام سے جانتی تھی۔ اس وقت اُن دو ہاتھوں کے حوالے سے اس کا وجود ترازو معلوم ہو رہا تھا' جو نیکی اور بدی کو تول رہی ہو۔۔۔

متوازن کر رہی ہو۔ صرف نیکی اور بدی نہیں' وہ نفرت اور محبت یاس اور امید کی
میزان معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ بھی منقسم تھا۔ ایک طرف روشنی تھی اور دوسری
طرف تاریک سائے۔۔۔ ایک طرف خدا اور دوسری طرف ابلیس۔

تانیا کے لیے وہ آگہی اور عرفان کا لمحہ تھا۔ اس لمحے میں اُس نے لڑکپن کی
چوکھٹ پار کی اور جوانی کی حدود میں قدم رکھ دیا۔ اب وہ ایک عورت تھی' جو اپنے
محبوب کو اپنے وجدان کے حوالے سے دیکھ' سمجھ اور پرکھ سکتی تھی۔ وہ اس شخص کو
پوری سچائی کے ساتھ پہچان سکتی تھی' جس نے شیطان بن کر زندگی گزارنے کی کوشش
کی تھی۔۔۔ جس نے انسان کی شکل کی کٹھ پتلیاں بنا کر خدا اور انسان۔۔۔ دونوں
کا مضحکہ اڑایا تھا۔ لیکن اس کی کٹھ پتلیوں میں اُس کے نہ چاہنے کے باوجود محبت اور
ہمدردی کی روشن صفات جگمگا اُٹھی تھیں۔۔۔ کہ خدائے بزرگ و برتر عظیم ترین
ہے۔

تانیا نے اُسے غور سے دیکھا۔۔۔ سمجھا کہ وہ کس طرح خود سے لڑتا رہا
ہے۔ اس نے وہ سزا بھی پڑھ لی' جو اُسے دی گئی۔ وہ جو بدی اور شیطنت کا پجاری
تھا' اُسے گھُن کی صورت نیکی دے دی گئی تھی۔ اُس کی اپنی تخلیق کی صورت میں اُس
کی مخلوق اُس پر حکمران ہو گئی تھی۔ وہ ساتوں پتلیاں اُس کے اپنے وجود کے حوالے
تھے۔۔۔ اور خدا نے اُن کے ذریعے اپنی تخلیق کے نورانی رُخ عیاں کر دیے تھے
جس سے تخلیق خود بھی بے خبر تھی۔ اُس پر بلا واسطہ زندگی کے دروازے بند کر دیے
گئے تھے۔ وہ اسٹال کے نچلے مخفی حصے میں پردے کے پیچھے ہی جی سکتا تھا۔۔۔ اور وہ
بھی اپنی باغی مخلوق کے حوالے سے۔ وہ ان میں نیکی کی روشنی دیکھ کر کڑھنے کے سوا
کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہی بے بسی اُس کی تلخی اور تندی کا سبب تھی۔ کم از کم وہ خود تو
شیطنت کا بھرپور مظاہرہ کرنے کے لیے آزاد تھا۔

اس ایک روشن لمحے میں تانیا نے اُس کے وجود میں اُترے ہوئے زہر

کٹھ پتلیاں

کے متعلق بھی جان لیا۔ وہ خود ہی اس کا تریاق تھی۔۔۔ لیکن اُس نے یہ
بھی جان لیا کہ وہ اُس سے کبھی محبت طلب نہیں کرے گا۔۔۔ کبھی اُس کے سامنے
دستِ سوال دراز نہیں کرے گا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ اگر اُس نے بن مانگے اُسے
محبت نہ دی تو وہ اندھیروں میں سسک سسک کر مر جائے گا۔ یہ۔۔۔ یہ ظلم ہوگا۔

تانیا نے بانہیں پھیلائیں۔ وہ جذبۂ ترحم نہیں تھا۔ کمزور اور سفلہ جذبہ۔
وہ جذبۂ عشق تھا۔ عظیم اور توانا جذبہ' جو زہر آلود جسم میں سے زہر ہلاہل یہ جانتے
ہوئے بھی چوس لیتا ہے کہ وہ زہر اُسے چاٹ جائے گا۔۔۔ کاٹ ڈالے گا۔۔۔
نفس نفس قتل کرے گا' قسطوں میں۔۔۔

''آذر۔۔۔ آذر۔۔۔ میرے آذر۔۔۔'' اس نے تڑپ کر اُسے
پکارا۔ پکار تو اُس کی بانہیں بھی رہی تھیں۔

اور اگلے ہی لمحے وہ کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح اُس کی بانہوں میں تھا۔
تانیا اُس کے لرزتے ہوئے جسم کو تھپتھپا رہی تھی۔۔۔ سرگوشیوں میں اُسے بتا رہی
تھی۔ ''آذر۔۔۔ میرے آذر۔۔۔ میں نے تو ہمیشہ تمہیں چاہا ہے۔ تم جیسے بھی ہو'
میں نے اس کے متعلق سوچے بغیر تمہاری پرستش کی ہے۔ میں کیا کروں تمہارے
لیے۔۔۔ میں تم سے محبت پر مجبور ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔''

وہ کم عمر تھی' آذر دُنیا دیکھ چکا تھا لیکن سہارا تو نو عمر لڑکی ہی دے رہی
تھی۔۔۔ اس طرح' جیسے اُس نے بارہا شرمسار چالباز کو سہارا دیا تھا۔ پھر
اندھیرے میں امید کی پہلی کرن پھوٹی۔ آذر تڑپ تڑپ کر' بکھر بکھر کر اُسے پکار رہا
تھا۔۔۔ ''تانی۔۔۔ تانی۔۔۔ تانی۔۔۔ میری تانی۔'' لیکن اُس نے اپنا چہرہ
چھپایا ہوا تھا' جیسے اُس کا سامنا نہ کرنا چاہتا ہو۔

''آذر۔۔۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں تمہیں کبھی اکیلا نہیں
چھوڑوں گی۔ میں کبھی تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔''

پھر تانیا کو اپنے ہاتھ پر نرم گرم اور گداز سیال کا لمس محسوس ہوا۔۔۔
اس ہاتھ پر، جس سے اُس نے بدصورت، حد درجہ شیطانی مگر روشن وجود کو سہارا دیا
ہوا تھا۔ اُسے پتا چل گیا کہ وہ آنسو ہیں، آنسو، جو بڑے محترم، بے حد مقدس ہوتے
ہیں۔۔۔ اور پھر وہ تو اُس شخص کے آنسو تھے، جو زندگی میں کبھی نہیں رویا تھا۔۔۔
آنسو ندامت اور پچھتاوے کے تھے۔۔۔ وہ آنسو محبت کے تھے۔ آذر کا بُت کدہ
ڈھل رہا تھا۔ اور بُت کدہ بھی کبھی بُت کدہ نہیں رہتا۔ وہ تو صرف کعبہ ہوتا ہے۔
بُت توڑے جانے کے بعد۔۔۔ ڈھلنے کے بعد۔

وہ اُس تاریکی میں دیر تک ایک دوسرے میں مدغم بیٹھے رہے۔ آذر عرف
مفلس خان نے اپنی رُوح۔۔۔ اپنا وجود اس معصومیت کو سونپ دیا تھا، جس سے
تمام عمر رُوح کی گہرائیوں سے نفرت کرتا رہا تھا۔ اس نے خود کو بیچ دیا تھا۔۔۔
محبت بھری بانہوں کے عوض۔۔۔ محبت کے عوض۔ زندگی میں پہلی بار وہ حالتِ
عبادت میں تھا۔

وہ اس وقت بھی نہیں ہٹے، جب قدموں کی چاپ قریب آتی گئی۔ گولو
بڑی حیرت اور محبت سے انہیں دیکھا۔۔۔ اور پھر ایک طرف ہٹ گیا، جہاں سے
اسٹال کے اندر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ پھر اُس نے اسٹال کے اسٹیج پر نظریں جمائیں اور
پکارا۔ ''ہیرو۔۔۔ چھوٹے باس۔۔۔ تم سب لوگ کہاں ہو۔ چالباز۔۔
راگی۔۔۔ رُستم۔۔۔ بدتمیزن۔۔۔ بھئی کہاں ہو تم لوگ۔ یہاں آؤ۔۔۔
تمہیں ایک خوشخبری سُنادوں۔ تانیا بی بی واپس آگئی ہیں۔ اب وہ کبھی ہمیں چھوڑ
نہیں جائیں گی۔۔۔ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔۔۔'' یہ کہہ کر اُس نے
ماؤتھ آرگن مُنہ سے لگالیا۔ فضا میں جانی پہچانی دُھن گونجنے لگی۔۔۔ ''اللہ
اللہ۔۔۔ اللہ ہی اللہ۔۔۔ اللہ ہی اللہ۔۔۔۔''

ختم شُد

زخمِ نہاں

علیم الحق حقی

یونیورسٹی کیمپس پولیس اسٹیشن میں وہ کال اتوار کی شام موصول ہوئی۔ اس وقت انسپکٹر منصور ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے فوری طور پر ایک ہیڈ کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور یونیورسٹی کے ہاسٹل کا رُخ کیا۔

ہاسٹل کے نگران کا نام جمشید تھا۔ اس نے انسپکٹر کے استفسار پر بتایا۔

''جی ہاں۔ راشد نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے کمرے میں کوئی گڑ بڑ ہے۔ لیکن اس نے مجھے تفصیل نہیں بتائی۔ نہ ہی کمرے میں جانے دیا۔ کہنے لگا۔۔۔۔ یہ پولیس کیس ہے۔ صرف پولیس ہی اندر جا سکتی ہے۔'' اس کے لہجے میں شکایت تھی۔ اس نے وہ دن بھی دیکھے تھے جب ہاسٹل میں اس کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا تھا۔ مگر اب تو زمانہ ہی اور تھا۔ ہاسٹل میں اسلحے کی بھرمار تھی۔ لڑکوں کے لبوں پر دھمکیاں ہوتی تھیں۔ وہ کسی کو روک ٹوک نہیں سکتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ نوکری پر لات مار کر چل دیتا۔ لیکن ریٹائرمنٹ کے قریب پہنچ کر آدمی بزدل ہو جاتا ہے۔

''اس کمرے میں کون کون رہتا ہے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''راشد نوید اور مظفر ملک۔۔ ہر کمرے میں دو لڑکے ہوتے ہیں۔'' جمشید نے جواب دیا۔

''یہ دونوں لڑکے ہیں کیسے؟''

''بہت اچھے۔'' جمشید نے جلدی سے کہا۔'' مجھے اسی پر تو حیرت ہے کہ ان کے کمرے میں کیا گڑ بڑ ہو سکتی ہے۔ دونوں ہی بہت اچھے ہیں۔ کبھی کسی ایسی

ویسی سرگرمی میں ملوث نہیں ہوئے۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور پڑھائی کو فل ٹائم جاب سمجھتے ہیں۔ آج سے پہلے راشد نے مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ وہ تو ہمیشہ میرا احترام کرتا تھا۔ اس جیسے چند لڑکوں ہی کی وجہ سے تو میرا بھرم قائم ہے۔'' اس کے لہجے میں دُکھ اُتر آیا تھا۔

''آپ ہمیں ان کے کمرے تک لے چلئے۔''

وہ کمرا دوسری منزل پر تھا۔ دروازہ نیم وا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ انسپکٹر سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے جمشید اور پھر ہیڈ کانسٹیبل تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر ایک لڑکے پر پڑی جو کرسی پر بیٹھا کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھا۔ کرسی کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ وہ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ بلب روشن نہ ہونے کی وجہ سے کمرے میں روشنی بہت کم تھی۔ لیکن لڑکے کو اس کی پروا نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ مطالعے میں پوری طرح منہمک تھا۔

انسپکٹر نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک جانب ایک بیڈ تھا اور دوسری جانب دوسرا بیڈ تھا۔ درمیان میں ایک میز اور چار کرسیاں تھیں۔ باقی دو دیواروں کے ساتھ دو رائٹنگ ٹیبلز تھیں۔ سامنے والی دیوار سے لگے ہوئے بیڈ پر کوئی چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ کرسی پر بیٹھا ہوا لڑکا اس نیم تاریکی میں بھی خوب روئی کا بھرپور تاثر چھوڑ رہا تھا۔ بلکہ ایسے میں اس کی آنکھوں کی بے پناہ چمک اور نمایاں ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً دراز قد اور خوش بدن بھی تھا۔ چہرے کے نقوش یونانی مجسموں جیسے تھے۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ کئی گھنٹوں سے کرسی پر اسی طرح بیٹھا ہے۔۔۔ ہلا بھی نہیں ہے۔

ان تینوں کے اندر آنے کے بعد لڑکے نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اس نے کتاب اپنے سینے پر ٹکائی اور بے نیازی سے سامنے والے بیڈ کی طرف اشارہ کر دیا۔

انسپکٹر بیڈ کی طرف بڑھا لیکن سب کچھ غیر واضح تھا۔

''میرا نام راشد نوید ہے۔'' کرسی پر بیٹھے ہوئے لڑکے نے بتایا۔

''چکر کیا ہے؟'' انسپکٹر نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

جمشید نے آگے بڑھ کر لائٹ آن کر دی۔

ایک لمحے کو انسپکٹر کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ پھر اس نے بیڈ پر لیٹے ہوئے لڑکے کا جائزہ لیا۔ وہ پیٹ کے بل لیٹا تھا۔ پھر انسپکٹر کو اس کے دونوں طرف خون کا تالاب سا نظر آیا۔۔۔ چہرے کے دونوں طرف' جہاں لڑکے کے ہاتھ رکھے تھے۔ اس کی دونوں کلائیاں کٹی ہوئی تھیں۔ غور سے دیکھنے پر دائنی سمت پڑا ہوا بلیڈ نظر آیا جس کے دونوں کنارے سرخ ہو رہے تھے۔

انسپکٹر بھی' جو موت کو ہر روپ میں دیکھ چکا تھا' یہ منظر دیکھ کر جھرجھری لے کر رہ گیا۔ پھر بھی اس نے آگے بڑھ کر لڑکے کے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ لیکن وہاں تو دھڑکن نام کا کوئی زخمی پرندہ بھی نہیں تھا۔ پنجرے میں موت کا سناٹا تھا۔

انسپکٹر کرسی پر بیٹھے ہوئے لڑکے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی عمر بیس سال سے زیادہ ہرگز نہیں تھی۔ اس نے کتاب سے نظریں بھی نہیں ہٹائیں۔ انسپکٹر کو یہ اداکاری نہیں لگی۔ وہ سفید قمیض اور سیاہ پینٹ پہنے ہوئے تھا۔ کمرے کی دیوار پر ٹینس کے کئی ریکٹ لٹکے تھے اور لڑکے کا جسم گواہی دیتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے ٹینس کھیلتا ہے۔

''تو یہ لڑکا مظفر ملک ہے؟'' انسپکٹر نے اس سے پوچھا۔ راشد نے کتاب سے نظریں اٹھائیں اور بولا۔ ''جی ہاں۔''

''اس کی عمر؟''

''انیس سال۔''

''لاش پہلی بار تم نے دیکھی؟''

''نہیں۔ میں نے اسے زندہ دیکھا۔۔۔۔ اور پھر قدم قدم موت کی طرف بڑھتے۔۔۔۔اور آخر کار ختم ہوتے دیکھا۔''

انسپکٹر گنگ ہوا کر اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔''کیا مطلب؟''

''میں نے بتایا نا۔۔۔۔ جو کچھ ہوا' میری نظروں کے سامنے ہوا' راشد نے جواب دیا۔

''تفصیل سے بتاؤ۔''

''میں دو بجے سے یہاں بیٹھا پڑھ رہا ہوں۔ کوئی آدھا گھنٹا پہلے مظہر آیا اور مجھ سے بولا۔۔۔۔ میں خودکشی کر رہا ہوں۔ پھر اس نے ریز نکالا اور بلیڈ لیٹ کر پہلے داہنی اور پھر بائیں کلائی کاٹ ڈالی۔''

''اور تم نے کچھ بھی نہیں کیا! تماشا دیکھتے رہے؟''

''نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں ایک لمحے کے لیے اٹھا اور اسے دیکھا وہ کلائیاں کاٹ چکا تھا۔۔۔۔اور عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔''

انسپکٹر چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا' پھر بولا۔''کہتے رہو۔''

''پھر اس نے سر اٹھائے بغیر منہ پھیر لیا۔۔۔۔دیوار کی طرف۔''

''تم نے کیا کیا؟''

''میں پھر پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔ ایک باب ختم کرنے کے بعد خیال آیا کہ آپ لوگوں کو مطلع کرنا چاہیے۔ میں نے جمشید صاحب سے تھانے فون کرنے کو کہا۔''

کمرے میں خاموشی تھی۔ تینوں افراد ساکت وصامت کھڑے تھے۔

''یعنی وہ یہیں پڑا مرتا رہا۔۔۔۔ اس نے تمہاری موجودگی میں کلائیاں کاٹیں۔۔۔۔اور تم بیٹھے پڑھتے رہے؟'' انسپکٹر کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں۔''

''کیوں؟''

''اسے اپنے بارے میں فیصلہ کرنے اور فیصلے پر عمل کرنے کا حق تھا۔ وہ بھی ہم سب کی طرح آزاد انسان' آزاد شہری تھا۔ پھر نہ وہ چیخا چلایا' نہ اس نے مدد کے لیے کسی کو پکارا۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔''

اب انسپکٹر اسے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ناپسندیدگی دیکھ کر راشد خفیف سا مسکرایا۔

''تمہیں یہ لڑکا اچھا لگتا تھا؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔ صورت حال اتنی غیر معمولی تھی کہ وہ تفتیش کے روایتی طریقے بھول گیا تھا۔

''جی ہاں۔ بہت زیادہ۔''

''بہت عرصے سے جانتے تھے اسے؟''

''جی ہاں۔ ہم اسکول میں بھی ساتھ پڑھتے تھے۔'' راشد نے جواب دیا۔''ہم اچھے دوست تھے۔ مجھے اس کی موت کا بہت افسوس ہے۔''

اس کا انداز جذبات سے عاری تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی علمی موضوع پر گفتگو کر رہا ہو۔ اس کی آواز ہموار' لہجہ حقیقت پسندانہ اور بات کرتے ہوئے چہرہ بے تاثر تھا۔ اس کی پوری توجہ اپنی کتاب پر تھی جیسے اس میں سے کچھ پڑھ کر سنا رہا ہو۔ ہیڈ کانسٹیبل بھی اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

انسپکٹر نے پوچھا۔''جب اس نے آ کر خودکشی کا ارادہ ظاہر کیا تو تم نے اس سے کیا کہا؟''

''کچھ بھی نہیں۔''

''تو کیا تم اس سے ناراض تھے؟''

''ہرگز نہیں۔''

''تو تم نے اسے مرنے سے روکا کیوں نہیں؟'' انسپکٹر جھنجھلا گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

''اپنے اوپر سب زیادہ حق اس کا ہی تھا۔ میرا نہیں۔''

''میں اپنے آفس جارہا ہوں۔'' ہاسٹل انچارج جمشید نے کہا۔ ''مجھے وی سی صاحب کو فون کرنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ فون کرکے کسی سائیکاٹرسٹ کو بھی طلب کرلیں۔'' انسپکٹر نے ہدایت دی۔ پھر راشد سے پوچھا۔ ''تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟''

''وکیل ہیں۔'' راشد نے جواب دیا۔

''اسے تو قتل قرار دیا جانا چاہیے۔'' ہیڈ کانسٹیبل نے دبی آواز میں انسپکٹر سے کہا۔

''نہیں قانوناً یہ قتل نہیں ہے۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔

راشد نے یہ بات سن لی تھی۔۔۔ اور وہ حیران رہ گیا تھا۔ قتل! اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اس پر اس طرح کا کوئی الزام بھی عائد ہوسکتا ہے۔ اس نے کچھ بھی تو نہیں کیا تھا۔ اس نے بس ایک بدصورت اور افسوسناک فعل سرزد ہوتے دیکھا تھا۔۔۔ اور وہ بھی کسی اور کے ہاتھوں۔ اس نے خود کچھ بھی تو نہیں کیا تھا۔ وہ سوچتا اور الجھتا رہا۔

کچھ دیر بعد ایمبولینس آگئی۔ راشد ایمبولینس والوں کو اپنے دوست کی لاش اسٹریچر پر رکھ کر لے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ بدستور اسی کرسی پر کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔

پھر سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر حشمت آگیا۔ راشد احتراماً اٹھا اور اس نے ڈاکٹر سے ہاتھ ملایا۔ ڈاکٹر کی عمر چالیس سے کچھ اوپر ہوگی۔ وہ پستہ قد اور فربہ اندام تھا۔ اس کے آنے کے بعد انسپکٹر اور ہیڈ کانسٹیبل بغیر ایک لفظ کہے کمرے سے چلے

گئے۔

ڈاکٹر نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد ایک سگریٹ سلگایا۔ اس نے ہاتھ جھٹک کر دیا سلائی بجھائی اور راشد سے پوچھا۔ ''یہ مظفر کون تھا؟''

''میرا روم میٹ'' راشد نے جواب دیا۔

''تمہارا پورا نام کیا ہے؟''

''راشد نوید۔''

''تم مشہور وکیل نوید کے بیٹے ہو؟''

''جی ہاں۔''

ڈاکٹر حشمت نے میز پر رکھی ایش ٹرے اپنی طرف گھسیٹ لی۔ اس نے ایش ٹرے میں راکھ گراتے ہوئے پوچھا۔ ''مظفر ملک نے خودکشی کیوں کی؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''اگر تم نے خودکشی کی ہوتی تو اس کی کیا وجہ ہوسکتی تھی؟''

راشد نے محسوس کیا کہ وہ سوال بڑی ہوشیاری سے اسے گھیرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ اس نے مظفر کو خودکشی کیوں کرنے دی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ وہ خاموشی سے ڈاکٹر حشمت کو ایش ٹرے میں راکھ جھاڑتے دیکھتا رہا۔ حالانکہ کافی دیر سے اس نے کش بھی نہیں لیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بس ایش ٹرے بھرنے کی کوشش کررہا ہے۔

ڈاکٹر حشمت اس کے جواب کا انتظار کررہا تھا۔

''کوئی وجہ نہیں ہوتی۔'' آخر کار راشد نے جواب دیا۔ ''اور آپ کا سوال خلافِ حقیقت بھی ہے۔ میں نے تو ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔''

''لیکن تم نے اسے خودکشی کرنے دی۔''

''جی ہاں۔''

''کیوں؟''

''کیوں نہ کرنے دیتا۔ وہ سمجھدار تھا' بالغ تھا' اپنا اچھا برا سمجھتا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا' وہ حادثے کی طرح نہیں تھا۔ اس نے بالارادہ کیا تھا۔۔۔۔''

ایش ٹرے میں راکھ جھاڑنے کا عمل رک گیا۔ ڈاکٹر حشمت کا ہاتھ ٹھٹکا۔ اس نے راشد کو بغور دیکھا۔ ''تم درست کہہ رہے ہو؟ تمہیں اس پر یقین بھی ہے؟''

''جی ہاں۔ میں آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عمل پر پورا یقین رکھتا ہوں۔ آزادیٔ عمل غلط طور پر استعمال کی جائے تو سزا بھی عمل کرنے والے ہی کو ملتی ہے۔ قانون کیوں بنایا گیا ہے۔۔۔۔ آزادیٔ عمل کا ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کے لیے۔ ورنہ قانون کی ضرورت ہی کیا تھی۔''

سائیکاٹرسٹ بیٹھا چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' یہ کہہ کر اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ پھر وہ اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے پلٹ کر راشد کی طرف دیکھا۔ ''تم دونوں کے درمیان کوئی خاص تعلق تھا؟'' اس نے پوچھا

''ہم بہت اچھے دوست تھے۔''

''اور کچھ؟''

''جی نہیں۔''

ڈاکٹر حشمت واپس آیا۔ اس نے جیب سے ایک ٹیبلٹ نکال کر میز پر رکھ دی۔ ''نیند نہ آئے تو اسے پانی سے لے لینا۔''

''آپ کے خیال میں مجھے اس کی ضرورت پڑے گی؟''

''پڑ سکتی ہے۔''

دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاکٹر نے دروازہ کھولا۔ دروازے پر ہاسٹل انچارج کھڑا تھا۔ وہ اندر نہیں آیا۔ اس نے باہر کھڑے کھڑے کہا۔

''راشد۔۔۔ منگل کے روز تین بجے تمہیں وی سی صاحب سے ملنا ہے۔'' پھر وہ ڈاکٹر حشمت کی طرف مڑا۔ ''اور آپ کو بھی۔''

''ٹھیک ہے۔'' راشد نے کہا۔ ڈاکٹر حشمت نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

راشد جانتا تھا کہ سائیکاٹرسٹ اب رخصت ہونے والا ہے۔ لیکن وہ اسے رخصت کرنے کے لیے کھڑا نہیں ہوا۔ حالانکہ اس نے اس کا خیر مقدم کھڑے ہو کر کیا تھا۔ لیکن اتنی دیر میں وہ راشد کی نظروں میں بے وقعت ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر حشمت نے اس کی طرف وزٹنگ کارڈ بڑھایا۔ ''ضرورت پڑے تو مجھے فون کر لینا۔ تم مجھ سے بات کر کے دل کا بوجھ بھی ہلکا کر سکتے ہو۔''

''جی' بہت بہتر۔''

ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ اسی کرسی پر بیٹھا رہا۔ وہ کبھی میز پر رکھی اپنی کتاب کو تکتا اور کبھی ایش ٹرے کو۔۔۔۔ اور پاؤں جھلاتا رہا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کرسی کے ہتھے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور ذہنی طور پر اپنی چیزوں کو مظفر کی چیزوں سے الگ کرتا رہا۔ کمرہ جتنا اس کا تھا اتنا ہی مظفر کا بھی تھا۔۔۔۔ اور اب بھی تھا۔ مینٹل پیس پر چار کیمرے رکھے تھے۔ ایک میز پر بھی رکھا تھا۔ وہ پانچوں اس کے تھے۔ ٹینس کے تمام ریکٹ بھی اسی کے تھے۔ دیوار پر لٹکی ہوئی پینٹ' شرٹ اور ٹینس کا نیکر مظفر کا تھا۔ تقریباً آدھی کتابیں بھی مظفر کی تھیں۔ اسے کتابوں کا جائزہ لے کر انہیں الگ الگ بھی کرنا تھا۔

وہ اٹھا اور کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ باہر خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ وہ باہر دیکھتا رہا۔ کیمپس کے درمیان چھوٹی سڑکوں کے بلب روشن ہو گئے تھے۔ ان کی روشنی دائروں کی شکل میں زمین پر پڑ رہی تھی۔ وہ پلٹا اور کمرے سے نکل کر آفس کی طرف چل دیا۔

آفس میں روشنی تھی۔ جمشید میز کے پیچھے بیٹھا کچھ کاغذات اِدھر اُدھر کر رہا تھا لیکن صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کی توجہ کاغذات پر نہیں ہے۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''ایکسکیوزمی۔'' راشد نے کہا۔ ''مجھے ایک فون کرنا ہے۔''

''ضرور۔۔۔ضرور۔'' جمشید نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم فون کر لو میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ آفس کا دروازہ لاک کر جانا۔''

اس کے جانے کے بعد راشد نے ریسیور اٹھایا اور آپریٹر کو اپنا نام اور کمرہ نمبر بتانے کے بعد لاہور کا نمبر دیا۔ پھر وہ کال ملنے کے انتظار میں انگلیاں چٹخاتا رہا۔

کچھ دیر بعد گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ ''لاہور بات کیجئے۔'' آپریٹر نے کہا۔

اگلے ہی لمحے ممی کی آواز ابھری۔ ''ہیلو۔۔۔؟''

''ممی۔۔۔ میں راشد بول رہا ہوں۔۔۔''

''میں کھانا کھا رہی ہوں۔ راشد۔۔۔ کیا تم کھانا نہیں کھاتے؟''

''ممی۔۔۔ ڈیڈی کہاں ہیں؟ مجھے ان سے ضروری بات کرنا ہے۔''

''کیوں؟ کیا بات ہے؟ تم پریشان معلوم ہو رہے ہو؟''

''آپ مجھے یہ بتائیں' ڈیڈی کہاں ہیں؟''

''وہ تو فیصل آباد گئے ہیں۔ بات کیا ہے راشد؟ کوئی پریشانی تمہیں؟'' ممی کے لہجے میں تشویش تھی۔

''آپ کسی طرح ان سے رابطہ کر کے کہیں کہ وہ مجھے ہاسٹل فون کر لیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کہہ دوں گی۔ لیکن سچ سچ بتاؤ۔ تم کسی مشکل میں

نہیں پھنس گئے؟''

''آپ بے فکر رہیں۔ بس ان سے میری بات کرا دیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھا اور دروازہ لاک کرتے ہوئے باہر نکل آیا۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے ایک کیسٹ لگایا اور موسیقی سننے میں منہمک ہو گیا۔

کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ ''آپ کا فون ہے راشد صاحب!'' رات کے چوکیدار نے کہا۔

وہ پھر آفس میں چلا آیا۔ آفس رات بھر کھلا رہتا تھا۔ صرف رات کا چوکیدار ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ ''ہیلو''

''راشد۔۔۔ ابھی کچھ دیر پہلے تمہاری ممی نے مجھے فون کر کے بتایا۔۔۔''

''جی ہاں ڈیڈی!''

''کیا بات ہے بیٹے!''

''ڈیڈی۔۔۔ مظفر نے آج شام خودکشی کر لی۔''

''اوہ۔۔۔ مجھے افسوس ہوا یہ سن کر۔''

''میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ ممکن ہے عنقریب میں یونیورسٹی چھوڑ دوں۔''

''کیا یہ ضروری ہے بیٹے؟''

''جی ہاں۔ ممکن ہے' مجھے یونیورسٹی سے خارج کر دیا جائے۔ منگل کو مجھے وائس چانسلر سے ملنا ہے۔''

''کیوں؟ یونیورسٹی سے کیوں خارج کیا جائے گا تمہیں؟''

''اس نے میری موجودگی میں خودکشی کی تھی۔ میں نے وہ پورا منظر دیکھا

تھا۔''

''خودکشی کیسے کی اس نے؟''

''بلیڈ سے اپنی کلائیاں کاٹ لی تھیں۔''

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی' پھر اس کے ڈیڈی نے پوچھا۔ ''تم کسی قانونی دشواری میں تو نہیں۔۔۔۔ میرا مطلب ہے' نظر بندی یا قانونی تحویل میں۔۔۔۔''

''نہیں۔ ویسے پولیس والوں نے اس بنیاد پر کہ میں اسے خودکشی کرتے دیکھتا رہا تھا' قتلِ عمد کا تذکرہ ضرور کیا تھا۔۔۔۔''

''پاگل ہو گئے ہیں۔۔۔۔ اور وہ اس بنیاد پر تمہیں گرفتار بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھو بیٹے۔۔۔۔ مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔ لیکن میں ہفتے تک گھر واپس آ جاؤں گا۔ دوسری طرف یونیورسٹی والے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے' وہ اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکیں گے۔ پھر آگے میں دیکھ لوں گا۔''

''بہت بہتر ڈیڈی۔''

''مجھے مظفر کے متعلق سن کر بہت افسوس ہوا بیٹے!''

''ایک دن سبھی کو جانا ہوتا ہے ڈیڈی!''

''ٹھیک ہے بیٹے' پھر ملاقات ہوگی۔''

وہ اپنے کمرے میں واپس آیا۔ کیسٹ بدستور بج رہا تھا۔ اس نے کیسٹ کو ریوائنڈ کیا تاکہ پورا کیسٹ سنا جا سکے۔۔۔۔

راشد کو فوٹو گرافی سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ وہ اس کی واحد تفریح تھی۔ اس عشق کا آغاز اس وقت ہوا' جب اس کی عمر صرف نو سال تھی۔ کسی نے سالگرہ کے موقع پر تحفے میں اسے کیمرہ دیا تھا۔ وہ اس کیمرے پر یوں فدا ہوا جیسے بچے کسی بھی من پسند چیز پر فدا ہوتے ہیں۔ وہ کیمرہ کندھے سے لٹکائے پھرتا۔۔۔۔ اور موقع پا کر بغیر بتائے کسی کی بھی تصویر کھینچ لیتا۔ بعض اوقات وہ ایک دن میں چھ رول تک استعمال کر لیتا۔ اس ابتدائی دور کی بعض تصویریں تو اب تک اس کے پاس محفوظ تھیں۔ ایک تصویر اس کے کتے کی بھی تھی جس میں وہ گھر کے دروازے کے سامنے بیٹھا تھا۔ ایک تصویر ماں کی تھی جو ایک پارٹی کے دوران لی گئی تھی۔

پھر بتدریج اسے اس فن کا شعور آنے لگا۔ اس کی نظر ایک فنکار کی نظر ہو گئی۔ اس کے انداز کی بے پروائی رخصت ہو گئی۔ وہ بہت احتیاط سے تصویریں لینے لگا۔ اس میں تحمل آ گیا۔ وہ مناسب ترین لمحے کا طویل انتظار بھی کر سکتا تھا۔ پہلے وہ کسی منظر کے بارے میں اندازہ لگاتا کہ کسی نہ کسی لمحے وہ قابلِ دید ہو گا۔۔۔۔ اور پھر اس لمحے کا انتظار کرتا۔ پھر اس نے تصویریں خود ہی ڈیولپ کرنا شروع کر دیں۔ ایک کمرے کو اس نے ڈارک روم بنا لیا۔ پھر رنگین فلموں کا دور آیا۔۔۔۔ اور وہ شوق خود بخود کم ہوتا گیا۔

پھر اس کے جیب خرچ کا بیشتر حصہ اچھے کیمروں اور لینسز کی خریداری پر صرف ہونے لگا۔ اس کی کارکردگی پروفیشنل فوٹو گرافروں سے بہتر ہو گئی۔ وہ کیمرہ خریدتا تو اس کے متعلق سب کچھ جاننے کے لیے گھنٹوں دکاندار کا دماغ بھی چاٹتا۔ عام طور پر دکاندار خوش ہوتے۔ اس کے شوق اور صدقِ طلب کو سراہتے۔ کیمروں کے بارے میں اس کی معلومات سے متاثر ہوتے۔

پھر اس کی کھینچی ہوئی تصویریں کوالٹی کے اعتبار سے بہتر ہوتی گئیں۔

زخمِ نہاں

چھٹیوں میں اس کا ایک ہی مشغلہ ہوتا۔ وہ کیمرہ کندھے سے لٹکاتا اور گھر سے نکل جاتا۔ وہ لوگوں کو بغور دیکھتا۔۔۔۔ اور موقع پا کر تصویر لے لیتا۔ اس کی کھینچی ہوئی کوئی کوئی تصویر تو بے حد آرٹسٹک ہوتی۔ کوئی کرکٹ یا ہاکی میچ ہوتا تو اس کی بن آتی۔ وہ میچ کے علاوہ میچ دیکھنے والوں کا بھی مشاہدہ کرتا اور بعض اوقات کھیل کے میدان کے ایکشن کو نظر انداز کر کے کسی تماشائی کی ایسی تصویر کھینچتا جو یادگار کہلانے کی حقدار ہوتی۔ ایک بار اس کی کھینچی ہوئی ایک تصویر کو ایک روزنامے کے تصویری مقابلے میں انعام بھی ملا تھا۔

وہ اور کیمرہ لازم وملزوم تھے۔ کیمرہ لیے بغیر وہ اسکول بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عام سی صورت حال میں بھی غیر معمولی تصویر کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ پھر کالج کے میگزین میں اس کی تصویریں باقاعدگی سے چھپیں۔ وہ کیمرہ ہر وقت اس لیے بھی ساتھ رکھتا تھا کہ لوگ اس کے عادی ہو جائیں۔۔۔۔ کیمرا کانشس نہ رہیں۔ ان کے لیے اس کا کیمرہ لباس سے زیادہ اہم نہ رہے۔ اس صورت میں وہ کسی بھی صورت حال میں اپنا فطری ردِعمل ظاہر کر سکیں گے۔ یہ بھی نہیں کہ وہ ہر وقت تصویر کھینچتا ہو۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا۔۔۔۔ اور جب ہوتا تھا تو وہ بے پناہ مشاہدے اور مہارت کے ساتھ ہوتا تھا۔ کیمرہ اس کے لیے حرفِ اظہار کی طرح تھا۔

چنانچہ اس رات وہ کیمرہ کندھے پر ڈال کر چہل قدمی کے لیے نکلا تو کسی نے اس پر خصوصی توجہ نہ دی۔ حالانکہ شام کے وقت جو کچھ ہوا تھا' سب کے علم میں تھا۔ یونیورسٹی اس طرح کے معاملات کو اخبارات کے صفحات سے دور رکھتی تھی کہ یہ اس کی تقدیس کا معاملہ تھا۔ لیکن یونیورسٹی کے اندر خبریں پر لگا کر اڑتی تھیں۔ پھر راشد اور مظفر دونوں یونیورسٹی کے مقبول لڑکوں میں سے تھے۔ فوٹوگرافی کے علاوہ راشد یونیورسٹی کی ٹینس ٹیم کے لیے ایک مضبوط ستون کی حیثیت رکھتا تھا۔ گزشتہ

سال انٹر یونیورسٹی چیمپئن شپ میں کامیابی اسی کی مرہونِ منت تھی۔ دوسری طرف مظفر بہت اچھا مقرر تھا۔ اس کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ کوئز مقابلوں میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس کی مقبولیت میں اس کی خوش مزاجی کا بھی بہت بڑا دخل تھا۔

دونوں کا موازنہ کیا جاتا تو مظفر زیادہ پسندیدہ قرار پاتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ طلبا کی رائے میں راشد قدرے مغرور اور بددماغ تھا۔ حالانکہ وہ بس ریزرو رہنے کا قائل تھا۔

مظفر کا تعلق اسلام آباد سے تھا جبکہ راشد لاہور کا تھا۔ مظفر نے ابتدائی تعلیم لاہور ہی میں حاصل کی تھی۔ وہیں دونوں کا ساتھ ہوا تھا۔ میٹرک کے بعد راشد نے کراچی میں تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو مظفر نے بھی اپنے گھر والوں سے اجازت لے لی اور اب۔۔۔۔

کچھ یہ وجہ بھی تھی کہ مظفر کی موت کے چند گھنٹے کے بعد ہاسٹل اور کیمپس والوں نے اسے کیمرہ لٹکائے چہل قدمی کرتے دیکھا تو انہیں کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

راشد آٹھ بجے کمرے سے نکلا تھا۔ ہاسٹل میں کھانے کا وقت ساڑھے سات بجے تھا۔ راشد نے دانستہ ڈائننگ ہال سے گریز کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی میز کے قریب کوئی نہیں پھٹکے گا۔ مگر سب اسے عجیب سی نظروں سے دیکھیں گے۔۔۔۔ جیسے وہ اچانک ہی بغیر کسی اعلان کے تبدیل ہو گیا ہو۔۔۔۔ اچھوت ہو گیا ہو۔ اسے معلوم تھا کہ ہال میں اس کی موجودگی لوگوں کے لیے پریشانی کا باعث ہوگی۔ انہیں ایسی باتوں پر اکسائے گی' جس سے وہ گریزاں ہوں گے۔ وہ ایک دوسرے سے گفتگو کے دوران اس معاملے میں اس کے کردار پر تعجب کا اظہار کریں گے۔ اور راشد کو موضوعِ گفتگو بننا سخت ناپسند تھا۔

یونیورسٹی کے باہر جھونپڑی میں ایک ہوٹل تھا جسے لڑکوں نے کیفے ڈی پھونس کا نام دے رکھا تھا۔ وہ جب بھی ڈائننگ ہال میں کھانا نہ کھاتا' کیفے

ڈی پھونس کا رخ کرتا۔ ویسے اتوار کی رات وہ ہمیشہ یہی کرتا تھا اور مظفر اس کا ساتھ دیتا تھا۔ اور آج بھی اتوار تھا۔ لیکن مظفر کھانے کی ضرورت سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

کھانے کے بعد اس نے چائے پی اور پیسے ادا کر کے نکل آیا۔

یونیورسٹی میں پہلے چوک کے قریب گرلز ہاسٹل کی طرف سے ثمینہ آتی دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی اس کی طرف لپکی۔

یہ ایک اور مسئلہ تھا۔ وہ تنہائی پسند تھا۔ لیکن لوگ اس کی طرف کھنچتے تھے۔ وہ اسے مداخلت تصور کرتا تھا۔ وہ بس میں بھی ایسی سیٹ پر بیٹھنا پسند کرتا تھا جو خالی ہوتی۔ اور اگر کوئی اس کے پاس آ بیٹھتا تو اسے بہت برا لگتا۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ڈائننگ ہال میں بھی وہ الگ تھلگ بیٹھتا تھا۔ ہال بہت بڑا تھا۔۔۔ اور کھانا کھانے وہ ہمیشہ دیر سے جاتا تھا۔ ایسے میں کوئی نہ کوئی خالی میز مل ہی جاتی تھی۔ اس کے باوجود کوئی نہ کوئی اس کی میز پر آ ہی جاتا۔ کبھی کبھی تو بھیڑ لگ جاتی۔ اس کے حوصلہ افزائی نہ کرنے کے باوجود لوگ اس کی طرف بڑھتے۔ اس نے اس سلسلے میں سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا سبب محض اس کی شخصی خوبصورتی ہے۔ بہر حال وہ ناپسندیدگی کے باوجود سب سے خوش اخلاقی سے پیش آتا۔ اس نے کبھی کسی کی نجی زندگی میں مداخلت نہیں کی تھی۔۔۔ تجسس نہیں کیا تھا۔ وہ تو اسے گناہ سمجھتا تھا۔ اور اس کا انداز ہر شخص کو تنبیہہ کرتا تھا کہ اس کی زندگی کے بارے میں بھی کوئی تجسس نہ کرے۔ وہ لوگوں سے ملتا تھا تو اپنی شرائط پر۔

اس وقت بھی اسے ثمینہ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وحشت ہونے لگی۔ ثمینہ' مظفر کی پسند تھی۔ مظفر کا ہر انداز اس کی محبت کا غماز تھا۔ ثمینہ بھی اس سے بہت اچھی طرح ملتی تھی۔ لیکن یہ بھی طے تھا کہ وہ مظفر سے محبت نہیں کرتی تھی۔ کبھی

یوں بھی ہوتا کہ مظفر فلم دیکھنے جانے کے لیے کہتا تو وہ منع کر دیتی۔ البتہ راشد ساتھ ہوتا تو وہ کبھی منع نہ کرتی۔ حالانکہ راشد کے ساتھ کوئی اور لڑکی ہوتی۔ مظفر اور راشد دونوں کو اس بات پر حیرت ہوتی۔ ایسا لگتا کہ وہ صرف راشد کی قربت میں وقت گزارنے کی خاطر مظفر کو قبول کر رہی ہے۔ مظفر نے کبھی اس پر کوئی منفی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ تو ثمینہ کی اس کمزوری سے پوری طرح فائدہ اٹھاتا تھا۔ ثمینہ کو کہیں جانے کے لیے رضامند کرنا ہوتا تو وہ راشد کو رضامند کر لیتا۔ یہ سنتے ہی کہ راشد بھی ساتھ ہوگا' ثمینہ فوراً تیار ہو جاتی۔ راشد کو یہ بات عجیب لگتی۔ وہ سوچتا کہ آخر یہ لڑکی چاہتی کیا ہے؟

ثمینہ اس کے قریب آ کر رک گئی۔ ''مجھے معلوم تھا' تم یہیں ملو گے۔'' وہ بولی۔ ''عظیم راشد نوید اپنے معمولات تو ترک نہیں کر سکتا۔ خواہ اس کا عزیز ترین دوست فرش پر خون کے تالاب میں نہا کر موت سے ہم کنار ہو چکا ہو۔'' اس کا لہجہ زہریلا تھا۔

''وہ فرش پر خون کے تالاب میں نہیں نہایا۔۔۔''

''تو پھر؟''

''بیڈ پر۔''

اس نے نفرت آمیز نگاہوں سے راشد کو دیکھا۔ ''تم بہت کمینے ہو۔۔۔ خبیث ہو۔''

اکا دکا طالب علم ان کے پاس سے گزرے۔ مگر کسی نے توجہ نہ دی۔ وہ قدرے تاریکی میں تھے۔ ثمینہ کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

''اور تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ اس کا۔۔۔ اپنے تفریح کے ساتھی کا سوگ منانے کے لیے مٹرگشت؟'' راشد نے ہموار لہجے میں کہا۔

''میں تم سے ملنا چاہتی تھی۔ تمہیں بتانا چاہتی تھی کہ تم قاتل ہو۔''

راشد نے نظریں چرا لیں۔ اس کے لیے ثمینہ کی آنکھوں سے جھانکتی نفرت کا سامنا کرنا ممکن نہیں تھا۔ ''مجھے افسوس ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں شرمندہ ہوں کہ میں نے تم پر طنز کیا۔ لیکن میں سمجھا تھا' تم مذاق کر رہی ہو۔''

''تم ناقابلِ برداشت' ناقابلِ فہم آدمی ہو راشد!''

''اور میں بھول گیا تھا کہ جذبات بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔ ویسے یہ بتا دوں' مظفر اس لیے مرا کہ وہ مرنا چاہتا تھا۔''

''مجھے امید ہے کہ تم بھی اسی طرح مرنا چاہو گے۔''

راشد نے بڑی بے یقینی سے اسے دیکھا۔ لیکن وہ اس سے بحث کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے جذبات سے اس کا کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ بحث کا کیا سوال!

''تم خود کو سمجھتے کیا ہو راشد؟'' وہ تقریباً چلا اٹھی۔

''معلوم نہیں۔''

''تمہارے گلے میں اس وقت بھی کیمرہ جھول رہا ہے۔ مجھے بتاؤ' تم نے کلائیاں کاٹتے ہوئے بھی اس کی کوئی تصویر لی یا نہیں۔ خون کے تالاب کو۔۔۔ اور اس کی بے نور آنکھوں کو بھی سیلولائیڈ پر منتقل کیا یا نہیں؟''

راشد نے ایک نظر اپنے کیمرے پر ڈالی اور بولا۔ ''نہیں۔''

''مجھے شدید حیرت ہے اس پر کہ تم نے مرتے وقت اس کے چہرے پر فلیش لائٹ مار کر اسے چونکایا بھی نہیں۔''

''فلیش لائٹ نہیں۔۔۔ فلیش بلب کہو۔'' راشد نے تصحیح کی۔

ثمینہ پر اچانک جنون طاری ہو گیا۔ اس نے اس کے کندھوں پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

''آئی ایم سوری ثمینہ۔ تم نے کھانا بھی نہیں کھایا شاید؟'' راشد نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''لعنت ہو تم۔ تم بے حس آدمی۔۔۔۔ پتھر۔ جانتے ہو' اس کی موت کے ذمے دار تم ہو۔ تمہاری وجہ سے میں نے اس کی محبت قبول نہیں کی۔ اگر تمہارا یہ روپ میں پہلے دیکھ لیتی تو کبھی ایسا نہ کرتی۔ اور اب دیکھ لیا ہے تو کچھ کیا نہیں جا سکتا۔ تم نے اسے قتل اور مجھے زندہ درگور کر دیا۔ بے رحم آدمی۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹی اور اندھا دھند گرلز ہاسٹل کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ ''میں تم سے نفرت کرتی ہوں!'' اس نے ایک بار پلٹ کر حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

راشد کا ذہن الجھتا رہا۔ کیا ثمینہ بھی۔۔۔ وہ بھی مظفر سے محبت کرتی تھی۔۔۔ اور اپنی محبت سے خود بھی بے خبر تھی۔ کیا پتا۔۔۔ وہ ان دونوں کی دانی سے چڑتی ہو۔ محبت میں لڑکیاں عجیب و غریب ہو جاتی ہیں۔ جہاں تک اس کا تعلق تھا تو اس نے ثمینہ کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اسے مسترد بھی نہیں کیا تھا۔ اسے تو متعارف بھی مظفر نے کرایا تھا۔۔۔ اور وہ اسے مظفر کی محبت کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اور کچھ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ دوست کی محبت پر ہاتھ ڈالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے ثمینہ کی وحشت' اس کے جذبات کی شدت اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

پھر اسے مظفر کے گھر والوں کا خیال آ گیا۔ اس کے متعلق ان کے جذبات یقیناً اس سے بھی زیادہ شدید ہوں گے۔ انہیں اکلوتے بیٹے کی موت پر کس قدر صدمہ ہو گا۔ کیسا شاک پہنچے گا۔ اسے اس کا اندازہ تھا کہ مظفر کے والدین نے موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق اپنی اولاد کو کس طرح آزادی دی ہو گی۔ لیکن اب وہ اپنے بیٹے کے پیرایۂ اظہار پر کس قدر شرمندہ ہوں گے۔ کتنے دکھی ہوں گے کہ مظفر نے آزادی کا غلط استعمال کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مظفر نے جو

کچھ کیا' اس کے لیے وہ آزاد تھا۔ مگر راشد زندگی اور اس سے متعلق حقائق کا بڑی بے رحمی سے تجزیہ کرنے کا قائل تھا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ مظفر کے والدین کے لیے وہ ہمدردی محسوس کرتا ہے۔۔۔۔ یا وہ ہمدردی کے مستحق بھی ہیں۔

پہلے اسے خیال آیا کہ اسے مظفر کی تدفین میں شریک ہونا چاہیے۔ آخر وہ لڑکپن کے زمانے سے اس کا دوست تھا۔ ان کی دلچسپیاں اور پریشانیاں مشترک رہی تھیں۔ ان کے مضامین ایک تھے۔ وہ مختلف موضوعات پر گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ اپنے بہترین دوست کی تدفین میں شریک ہو۔ لیکن اسے یہ احساس بھی تھا کہ مظفر کے والدین اس موقع پر اس کی موجودگی پسند نہیں کریں گے۔ یونیورسٹی والوں نے تمام حقائق ان کے گوش گزار کر دیے ہوں گے۔ ان کے نزدیک بھی مظفر کی موت کا ذمے دار وہی ہوگا۔ ان کا ردِعمل خالصتاً جذباتی ہوگا۔ تدفین میں اُس کی شرکت ان کے لیے نفرت انگیز ہوگی۔

تدفین میں شرکت نہ کرنا اس کے لیے کوئی بوجھ نہیں تھا۔ اس نے خود کو ہمیشہ جذبات سے دور اور محفوظ رکھا تھا۔ آدمی مرجائے تو پھر اس کے تعلق کے حوالے سے کسی چیز کی اہمیت نہیں رہتی۔ کم از کم راشد کا یہی خیال تھا۔

اگلے روز راشد کو کلاس اٹینڈ کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ اپنے ہم جماعتوں سے منہ چھپا رہا تھا۔ وہ تو خود ان کی بہتری کی خاطر ان سے گریزاں تھا۔ اسے احساس تھا کہ اس کی موجودگی ان کے لیے پریشانی اور خجالت کا باعث ہوگی۔ وہ عادتاً لوگوں کے جذبات سے خود کو دور رکھتا تھا۔ چنانچہ اس

روز وہ کوئی پیریڈ لینے کے بجائے مظفر کا سامان سمیٹنے میں لگا رہا۔ سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ مظفر کے بستر کی خون آلود چادر جلادی۔ یہ کام وہ گزشتہ رات ہی کو کردیتا مگر اس وقت تک خون سوکھا نہیں تھا۔ چادر سے نمٹنے کے بعد اس نے مظفر کے کپڑے، کتابیں اور دیگر چیزیں یکجا کر کے ایک ٹرنک میں رکھ دیں۔ پھر اس نے چپراسی کو بلا کر ٹرنک نیچے اسٹور میں بھجوادیا۔

یہ کام نمٹانا اس کی ذمے داری تھی۔ ایسے المناک موقعوں پر یہ کام مرنے والے کے روم میٹ کے سپرد کردیا جاتا تھا۔ یہ ایک غیر تحریری ضابطہ تھا۔ یہ کام والدین نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ وہ بے چارے تو وہاں آنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ خاص طور پر خودکشی کی صورت میں۔ شدید دُکھ کے راستوں سے ہر شخص گزرتا ہے۔ وہ تو کبھی سامان واپس لینے بھی نہیں آتے۔

میز کی درازیں خالی کرنے کے دوران میں راشد کو ایک تصویر ملی۔ اس نے تصویر کو بغور دیکھا۔ یہ تصویر وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ مظفر کی بہن سمیرا کی تصویر تھی۔ تصویر زیادہ اچھی نہیں تھی۔ لیکن اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ سمیرا بہت حسین لڑکی ہے۔ اس کے انداز میں خوداعتمادی تھی اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔

مظفر اور راشد ایک دوسرے کے بہت قریب تھے لیکن راشد سمیرا سے کبھی نہیں ملا تھا۔ اس بات کی اہمیت کا راشد کو پہلے کبھی احساس نہیں ہوا۔ لیکن اب سمیرا کی تصویر پر نگاہیں جمائے وہ اسی سلسلے میں سوچ رہا تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ

دوسرے شہروں میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران نہ اسکول میں' نہ کالج میں' نہ یونیورسٹی میں۔۔۔۔اس کے گھر سے کبھی کوئی اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ موسم گرما کی چھٹیاں مظفر زیادہ تر اس کے ساتھ ہی گزارتا۔ گھر وہ کم ہی جاتا۔ اس نے چھٹیاں گزارنے کے لیے راشد کو کبھی اپنے گھر مدعو بھی نہیں کیا تھا۔

راشد کو مظفر کے گھر والوں کے متعلق علم صرف ان کے خطوط سے ہوتا تھا جو مظفر کو کبھی کبھار موصول ہوتے تھے۔ کبھی کوئی عید کارڈ یا سالگرہ کے موقع پر مبارک باد کا کارڈ بھی موصول ہوتا۔ کبھی کبھی کوئی فون کال بھی آتی۔ لیکن مظفر اپنے گھر والوں کے متعلق زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ البتہ اصرار کرنے پر وہ اپنے گھر والوں کے متعلق تھوڑی بہت گفتگو کر لیتا۔

مظفر کا باپ آرکیٹیکٹ تھا۔ رہائش اسلام آباد میں تھی۔ ایک بنگلہ مری میں بھی تھا۔ سمیرا مظفر سے ایک سال چھوٹی تھی۔ وہ بھی تعلیم کے سلسلے میں گھر سے دور رہتی تھی۔ اس سے آگے وہ کچھ نہیں بتاتا تھا۔ اپنی نجی زندگی کے یہ تھوڑے سے حقائق وہ اس طرح بیان کرتا جیسے کسی فائل سے پڑھ کر سنا رہا ہو۔ کچھ عرصے بعد راشد نے اپنے تجسس پر قابو پانا سیکھ لیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مظفر اپنے گھر والوں کے متعلق بات کرتے ہوئے ہچکچاتا نہیں۔ بس وہ ان کے متعلق زیادہ جانتا نہیں ہے۔ وہ تعلیم کے سلسلے میں ان سے دور تھا۔۔۔۔اور وہ لوگ خود زیادہ تر سفر میں رہتے تھے۔۔۔۔کبھی یہاں' کبھی وہاں۔ ٹک کر بیٹھنا تو جیسے انہیں آتا ہی نہیں تھا۔

راشد' مظفر کی تدفین میں شرکت کے لیے تو نہیں جا رہا تھا مگر وہ اس کے گھر والوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ وہ سمیرا کے بارے میں کچھ زیادہ ہی متجسس تھا۔ اس کے دل میں سمیرا سے ملنے کی خواہش جاگ اٹھی تھی۔ سمیرا کی تصویر مظفر کے سامان کی وہ واحد چیز تھی جو اس نے ٹرنک میں نہیں رکھی۔ اسے معلوم تھا

کہ یہ ٹرنک تا ابد اسٹور میں پڑا رہے گا۔ کوئی اسے کھول کر دیکھے گا بھی نہیں۔

منگل کی صبح وہ ٹینس کورٹ کی طرف نکل گیا اور پریکٹس کی غرض سے ایک لڑکے کے ساتھ تین سیٹ کھیلے۔ وہ سنگلز کا بہترین کھلاڑی تھا۔ اس کی سروس بہت تیز اور صاف تھی اور ریٹرن وہ بہت بے رحمی سے دیتا تھا۔ یونیورسٹی کے دوسرے کھلاڑیوں میں اور اس میں نمایاں فرق یہ تھا کہ اسے کوئی ہلا نہیں سکتا تھا وہ اعصاب زدہ نہیں ہوتا تھا کبھی دباؤ میں نہیں کھیلتا تھا۔ یوں اسے اپنے ہر حریف پر فوقیت حاصل ہوتی تھی۔۔۔۔اور زیادہ تر اس کے حصے میں فتح ہی آتی تھی۔ سنگلز اسے پسند بھی تھا اور اسکے مزاج کے عین مطابق بھی۔ اس میں ساری ذمے داری اس کی اپنی تھی۔۔۔۔اور سامنے صرف ایک حریف ہوتا تھا۔ اسے ٹیم گیم اچھے نہیں لگتے تھے۔ چند تجربات کے بعد وہ ٹیم گیمز سے متنفر ہی ہو گیا۔ ٹیم کی صورت میں تمام کھلاڑیوں کے درمیان ایک ہم آہنگی کی ضرورت ہوتی تھی جس کا پیدا ہونا بے حد مشکل تھا۔ کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی سے کوئی گڑبڑ ضرور ہو جاتی تھی جس سے کھیل کی مجموعی صورت متاثر ہوتی۔ اسی لیے اس کی تمام تر توجہ ٹینس پر مرکوز ہو گئی تھی۔ وہ ٹینس نہ خوشی کے لیے کھیلتا تھا اور نہ ہی کسی کو شکست دینے کے لیے۔ وہ تو بس اس کے لیے ایک جسمانی ورزش تھی۔ اسے ہار جیت سے بھی کوئی غرض نہیں تھی۔ لیکن وہ بے داغ کھیل کھیلنے کا قائل تھا۔۔۔۔عیوب سے پاک صاف ستھرا اور خوبصورت کھیل۔

شام تین بجے اسے وائس چانسلر سے ملنا تھا۔ وائس چانسلر کے کمرے میں وائس چانسلر کے علاوہ ہاسٹل انچارج اور ماہر نفسیات ڈاکٹر حشمت موجود تھے۔ وہ

کمرے میں داخل ہوا تو اسے سب کے انداز میں سرد مہری محسوس ہوئی۔ وائس چانسلر نے اسے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اس کی میز پر کاغذات کا ڈھیر تھا۔

''بیٹھ جاؤ راشد!'' بالآخر وائس چانسلر نے کہا۔

لیکن راشد کھڑا رہا۔ اس نے کہا۔ ''میں پہلے آپ کو یہ بتا دوں کہ میں جلد از جلد یونیورسٹی چھوڑنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے ڈیڈی کو بھی مطلع کر دیا ہے۔۔۔۔ اور اس سلسلے میں تحریری اطلاع نامہ میری جیب میں موجود ہے۔''

وائس چانسلر نے پہلی بار نظریں اٹھائیں اور اسے تولنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ راشد کی آواز اور لہجے میں نہ سرکشی تھی' نہ بدتمیزی اور نہ ہی مایوسی اور سوگواری۔ اس کا لہجہ بے تاثر تھا۔ ''تم نے یہ کیوں کہا کہ پہلے آپ کو یہ بتا دوں؟'' وائس چانسلر نے راشد سے پوچھا۔

''آپ کو زحمت سے بچانے کے لیے۔'' راشد کا لہجہ اب بھی بے تاثر تھا۔

''جو کچھ ہم کہنے والے ہیں' تم اس سے خوف زدہ ہو؟'' ڈاکٹر حشمت نے پوچھا۔

''نہیں۔''

ان تینوں نے اسے بغور دیکھا۔۔۔۔ اور جان لیا کہ اس نے پوری سچائی سے جواب دیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوف کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

''آپ کیا کہتے ہیں کیا سوچتے ہیں' مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔'' راشد نے مزید کہا۔ پھر اس نے نظریں جھکا لیں۔ ''یہ بات نہیں کہ میں آپ کا احترام نہیں کرتا۔ میری صاف گوئی کو بدتمیزی نہ سمجھئے گا۔'' وہ تینوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔ راشد نے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''مگر میں ایک بات جاننا

چاہتا ہوں۔ مجھ پر قتلِ عمد کا الزام تو نہیں عائد کیا گیا؟''

''نہیں۔'' وائس چانسلر نے کہا۔ ''میں نے ایس پی سے بات کی تھی۔ تم پر کوئی الزام نہیں۔ دراصل تمہارا جرم قانونی نہیں' اخلاقی ہے۔'' پھر اس نے راشد کا ردِعمل دیکھنے کے لیے اسے بغور دیکھا۔ لیکن راشد کا چہرہ بے تاثر تھا۔

''ایک بات بتاؤ۔ تم یونیورسٹی کیوں چھوڑنا چاہتے ہو؟'' وائس چانسلر نے پوچھا۔

راشد نے نظریں اٹھا کر ڈاکٹر حشمت کو دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب یونیورسٹی میں رہا تو اس کی نجی زندگی میں لڑکے ایسے مداخلت کریں گے جیسے ایک دیوار گر جانے سے گھر راہ گزر ہو جاتا ہے۔ ''میں اب یہاں خود کو کبھی آزاد محسوس نہیں کر سکوں گا۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہیں یہ خدشہ ہے کہ ہم تمہیں یونیورسٹی سے نکال دیں گے؟''

''میں نے ایسا سوچا ضرور ہے۔''

وائس چانسلر نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر پھیلا کر ان پر نظریں جما دیں۔ ''ہم لڑکوں کو اس خطا کی بنیاد پر یونیورسٹی سے نکالنے کے قائل نہیں جسے ہم خود بھی سمجھ نہ سکیں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ درحقیقت ہم اس سلسلے میں نفسیات کی مدد سے جاننا۔۔۔۔ سمجھنا چاہتے ہیں۔ لیکن تم ہم سے دور ہو کر خود کو ہماری مدد سے محروم کر رہے ہو۔''

''میں آپ کی بات کو سمجھ رہا ہوں۔'' راشد نے جیب سے درخواست نکال کر وی سی کے سامنے رکھے ہوئے کاغذات پر رکھ دی۔ وہ جانتا تھا کہ کاغذات کا وہ ڈھیر بھی اسی سے متعلق ہے۔ پھر اس نے سوالیہ نظروں سے وی سی کو دیکھا۔ گویا اجازت کا خواہاں ہو۔

وائس چانسلر نے ایک آہ بھری' سر اٹھا کر راشد کو دیکھا۔ پھر اس نے جو

کچھ کہا' اس نے راشد کو حیران کر دیا۔ ''خدا تمہاری مدد کرے راشد میاں
دعائیں' میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''
''شکریہ سر!۔''

جمعرات کی صبح تک وہ روانگی کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ اس نے ماں
فون پر بتا دیا تھا کہ وہ کس گاڑی سے آرہا ہے۔ چنانچہ عمر دراز گاڑی لیے اسٹیشن
اس کا منتظر تھا۔ اس نے راشد کا سامان ڈکی میں رکھا۔ ''کہو عمر دراز۔۔۔
تمہارا کیا حال ہے؟ اور ہاجرہ خالہ کیسی ہیں؟'' راشد نے پوچھا۔
''ہم ٹھیک ٹھاک ہیں۔تم اپنی سناؤ ماسٹر!''
عمر دراز بہت پرانا ملازم تھا۔ ہاجرہ اُس سے بھی پہلے کی تھی۔ عمر دراز
نے ان کے ہاں ملازمت کے دوسرے ہی سال ہاجرہ سے شادی کر لی تھی
دونوں بے حد مستعد اور نفاست پسند تھے۔ اسی لیے راشد انہیں بہت پسند کرتا تھا
دوسری طرف وہ دونوں بھی راشد کو پسند کرتے تھے۔۔۔۔ اور شاید اس کی وجہ
وہی صفات تھیں۔ وہ اس کی تنہائی پسندی سے بھی واقف تھے۔۔۔۔ اور شاید اس
سبب بھی جانتے تھے۔ گھر میں پارٹیاں کثرت سے ہوتی تھیں۔ ایسے میں ہاجرہ
خاموشی سے راشد کا کھانا اس کے کمرے میں پہنچا دیتی تھی۔
''وہ تمہارا دوست کہاں ہے۔۔۔۔ مظفر؟'' عمر دراز نے اچانک
پوچھا۔
راشد نے اندازہ لگایا کہ عمر دراز حقائق سے بے خبر ہے۔ اس پر اُسے
حیرت ہوئی۔ کیونکہ عام طور پر ملازمین سے گھر کی کوئی خبر چھپی نہیں رہ سکتی۔ وہ

ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے اِدھر اُدھر کی سن کر۔۔۔۔ کاغذ
کا کوئی پرزہ دیکھ کر سب کچھ جان لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا تھا کہ مظفر کی
موت نے ہر شخص کو دہلا دیا ہے کہ کوئی اس کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتا۔ ورنہ عمر دراز کو
معلوم نہ ہونے کا کوئی جواز نہیں۔ وہ تو گھر کے فرد کی حیثیت رکھتا تھا۔ بہر حال
راشد نے سوچا کہ حقیقت بتانے میں کوئی حرج نہیں۔ ''مظفر کا تو انتقال ہو گیا۔''
اس نے سادگی سے کہا۔
عمر دراز کو جھٹکا لگا۔ اس کے چہرے پر حیرت۔۔۔۔ اور پھر دُکھ کا تاثر
اُبھرا۔ راشد کو اندازہ نہیں تھا کہ عمر دراز مظفر کو اتنا زیادہ پسند کرتا ہوگا۔ تاہم عمر
دراز کے رّدِعمل سے اسے خوشی ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ عمر دراز کو تفتیش کی عادت نہیں
ہے۔
گاڑی راشد ہی نے ڈرائیو کی۔ وہ گھر آتا تو اپنا ڈرائیونگ کا شوق
ضرور پورا کرتا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر راشد کو اچانک چکر سے آئے۔ وہ اس کے لیے
عجیب سا تجربہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ در و دیوار اسے اپنی طرف کھینچ رہے
ہیں۔۔۔۔ اور اس کا جسم مزاحمت کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا جی متلانے
لگا۔ اسے ایسے لگا جیسے ابھی قے ہو جائے گی۔ اس نے اپنا منہ سختی سے بھینچا اور
گہری گہری سانسیں لیں۔ یہ اس نے بہت پہلے جان لیا تھا کہ سانسیں ہموار کر لی
جائیں تو جذبات پر فتح پائی جا سکتی ہے۔۔۔۔ آدمی خود کو رونے سے بھی باز رکھ سکتا
ہے۔ اس بار بھی سانسوں نے اس کا ساتھ دیا۔ اس کا جسم۔۔۔۔ اور جسم کے

عضلات پرسکون ہوگئے۔ البتہ پیٹ میں گڑبڑ کا احساس بدستور تھا۔ وہ ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ گزشتہ چند روز کے دوران وہ کھانے کے معاملے میں بہت بے پروا ہو گیا تھا۔

مگر پھر اس کی آنکھوں کے سامنے فلم سی چلنے لگی۔ وہ کبھی تصوراتی نہیں رہا تھا۔ اس نے خود کو تصوراتی بننے بھی نہیں دیا تھا۔ وہ فوٹوگرافر تھا۔ جو کچھ حقیقت میں نگاہوں کے سامنے ہوتا تھا' اسے صرف وہی دکھائی بھی دیتا تھا۔ فوٹوگرافی کی طرف اس کے جھکاؤ کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ اس کی آنکھ ایک فوٹوگرافر کی تربیت یافتہ آنکھ تھی۔ وہ ان چہروں کو نہیں دیکھتی تھی جو اس کے سامنے نہیں ہوتے تھے۔

لیکن اس لمحے وہ انہونی ہو رہی تھی۔۔۔ اور وہ کوشش کے باوجود اسے روک نہیں پا رہا تھا۔ سب سے پہلے تو اسے اپنا پرانا کتا نظر آیا۔ وہ کتا جو مر گیا تھا۔ پھر اسے ماں کا چہرہ نظر آیا۔ وہ بانہیں پھیلائے جیسے کسی کا استقبال کر رہی تھی۔ اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ پھر وہی منظر مختلف مقامات کے پس منظر میں اسے نظر آیا۔ کبھی گھر کا ڈرائنگ روم' کبھی ممی کا بیڈ روم' کبھی کسی کے گھر ہونے والی کوئی پارٹی۔۔۔ اور ممی جسے ریسیو کر رہی تھیں' وہ فریم سے باہر تھا۔ لیکن راشد جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔ البتہ وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

پھر اسے مظفر دکھائی دیا۔ وہ آہستہ آہستہ سر گھما کر اس سے منہ پھیر رہا تھا۔۔۔ دیوار کی طرف رخ کر رہا تھا۔ اس کی بولتی ہوئی آنکھوں کا تاثر اسے بے حد واضح طور پر نظر آیا۔ وہ آنکھیں کسی زخمی جانور کی آنکھوں سے مشابہ تھیں۔ وہ آہستہ سے گھومتا ہوا سر' دیوار کی طرف مڑتا ہوا۔۔۔ پھر وہ عکس تسلسل کے ساتھ بار بار اسے نظر آتا رہا جیسے ہر بار کوئی اسے ریوائنڈ کر رہا ہو۔ راشد کوشش کے باوجود اس خیال سے پیچھا نہ چھڑا سکا کہ ان آنکھوں میں اذیت ہے۔۔۔ شکایت ہے۔ وہ آنکھیں اسے الزام دے رہی تھیں۔ پھر اسے روتی ہوئی ثمینہ کا

چہرہ یاد آیا۔ اس کی آنکھوں سے بے پناہ نفرت جھانک رہی تھی۔ ایک بار پھر مظفر کی نگاہیں اُبھریں۔۔۔ اور اس کے بعد جیسے ہر منظر صاف ہو گیا۔

عمر دراز اس کی یہ کیفیت بغور دیکھ رہا تھا' بولا۔ ''طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟ چہرہ بالکل سفید ہو گیا ہے۔''

راشد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے معلوم تھا کہ عمر دراز اب مزید کچھ نہیں پوچھے گا۔

نوید حسن کا مختصر سا گھرانا مثالی خوش حال گھرانا تھا۔ وہ بہت نامور وکیل تھا۔۔۔ انکم ٹیکس اسپیشلسٹ۔ اس کی پریکٹس بہت کامیاب تھی اور وہ بہت مصروف آدمی تھا۔ وکالت کے علاوہ اس نے کچھ اچھی کمپنیوں میں سرمایہ کاری بھی کر رکھی تھی۔ چنانچہ آمدنی بے حد و حساب تھی۔ دھن کا ویسے بھی یہ مزاج ہے کہ برستا ہے تو ٹوٹ کر برستا ہے۔ راشد جانتا تھا کہ رات کا کھانا اسے اپنے کمرے میں نہیں ملے گا بلکہ اسے نیچے جانا پڑے گا۔ یہ اصول کی بات تھی۔ اپنی گھر واپسی کی پہلی رات اسے کھانا ڈائننگ ہال میں ہی کھانا پڑتا۔

وہ نہا کر باتھ روم سے نکلا تو عمر دراز کو کمرے میں موجود پایا۔

''تمہیں کھانے پر بلایا جا رہا ہے۔'' اس نے راشد سے کہا۔

''کون کون ہے؟''

''بیگم صاحبہ اور سلمان صاحب۔'' عمر دراز نے جواب دیا۔ ''کہو تو جا کر منع کر دوں اور تمہارا کھانا اوپر بھجوا دوں؟'' اس کے لہجے میں شفقت اور تفہیم تھی۔

''نہیں پہلی رات تو مجبوری ہے۔''

''تو پھر چلے آؤ۔''

راشد نے شلوار کرتا پہنا اور نچلی منزل کی طرف چل دیا۔ ڈائننگ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے اپنا نام سنا تو اندر جانے کے بجائے دروازے پر ہی رک گیا۔ وقت نے اسے ایسے موقعوں پر دروازوں سے کان لگانا سکھا دیا تھا۔

''راشد نیچے آنے ہی والا ہے۔'' اس کی ماں کہہ رہی تھی۔ ''تم مائنڈ تو نہیں کرو گے؟''

''میں کیوں مائنڈ کرنے لگا۔'' یہ سلمان کی آواز تھی۔

''راشد کا ستارہ جدی ہے۔ کہیں یہ سب کچھ اسی وجہ سے تو نہیں۔ سردیوں میں پیدا ہونے والے بچے سرد مہر ہوتے ہوں گے۔''

راشد پلٹا اور اسٹڈی میں چلا گیا۔ ڈیڈی کی میز کی دراز سے سگریٹ نکال کر اس نے سلگائی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کبھی کبھار ہی سگریٹ پیتا تھا۔

ممی اور سلمان کا تعلق گزشتہ آٹھ سال سے اس کے علم میں تھا۔ پہلی بار جب اس نے انہیں دیکھا تو دھک سے رہ گیا تھا۔ اس روز دنیا کا سب سے قابلِ احترام رشتہ اس کی نظروں میں حقیر ہو گیا تھا لیکن جیسے اس کے سوا کسی کو اس بات کی پروا ہی نہیں تھی۔ چنانچہ وہ بھی بے پروا ہو گیا۔ ممی اکثر سلمان کے ساتھ باہر بھی جاتی تھیں۔

سلمان ایک بینک کا نائب صدر تھا۔ ڈیڈی کی اس سے دوستی تھی۔ ''

اسے کافی حد تک پسند کرتے تھے۔ وہ دونوں ایک ہی کلب کے ممبر تھے۔۔۔۔ اور اسکواش بھی ساتھ ہی کھیلتے تھے۔ اسے تو ایسا لگتا کہ ڈیڈی بھی سب کچھ جانتے ہیں۔ لیکن ان کے اور سلمان کے درمیان کوئی مفاہمت موجود ہے۔ ممکن ہے گھر میں کبھی کوئی جذباتی بحران آیا ہو اور انہوں نے سکون سے بیٹھ کر کوئی تصفیہ کر لیا ہو گا۔ جو کچھ بھی رہا ہو، سامنے کبھی کچھ نہیں آیا تھا۔

تصفیہ تو خود راشد نے بھی کر لیا تھا۔ پہلی آگہی کی اذیت اسے اب بھی یاد تھی۔ اس وقت اسے لگتا تھا کہ وہ اذیت اسے مار ڈالے گی۔ اور اسی وقت اسے اندازہ ہوا کہ جذبات بڑی سفاک شے ہوتے ہیں۔۔۔۔ دو دھاری تلوار کی طرح۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ جذبات کے ہاتھوں ہی مرے گا۔ چنانچہ بقا کے لیے ضروری تھا کہ جذبات سے اپنا ناتا توڑ لیا جائے۔ خود کو کبھی کسی جذبے میں ملوث ہی نہ کیا جائے۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ ڈائننگ روم میں داخل ہوا۔ سلمان نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کی آنکھوں کی دھندلاہٹ سے راشد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی حد تک نشے میں ہے۔ ممی نے اٹھ کر یوں بانہیں پھیلائیں، جیسے اس سے بانہوں میں سما جانے کی توقع کر رہی ہوں۔

''واہ۔۔۔۔ میرا راشد ہمیشہ کی طرح خوبصورت لگ رہا ہے۔''

اس نے ممی کی پیشانی پر پیار کیا۔ ''میری ممی!''

وہ تینوں بیٹھ گئے۔ ممی کا استقبال کرنے کا وہ انداز اب بھی ویسا ہی تھا وہ کسی کا بھی خیر مقدم کرتیں، اسی انداز میں کرتیں۔ وہ راشد ہوتا، سلمان ہوتا، ڈیڈی ہوتے یا کوئی اور۔ ان کا اسٹائل یہی رہتا۔ چہرے کا تاثر تک نہ بدلتا۔

''کہو راشد۔۔۔۔ ٹینس کیسی جا رہی ہے؟'' سلمان نے پوچھا۔

''بہت اچھی۔'' راشد نے جواب دیا اور پھر ماں کی طرف متوجہ ہوا۔

''آپ کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ٹھاک ہوں۔ تمہارے ڈیڈی کل شام کی فلائٹ سے واپس آ رہے ہیں۔''

راشد نے کوئی جواب نہ دیا۔

''سلمان۔۔۔راشد کتنا ہینڈسم ہے۔ ہے نا؟'' ممی نے کہا۔ ''تم نے اتنا ہینڈسم لڑکا کبھی دیکھا ہے؟''

راشد کو اندازہ تھا کہ وہ دونوں کچھ پریشان ہیں۔ سلمان کچھ نشے میں تھا۔ اس وجہ سے اس کی بے چینی عیاں تھی۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو صفیہ' لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تمہارا بیٹا کہاں سے ہے۔۔۔کیسے ہے!'' سلمان نے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ یہ میرا بیٹا ہے۔ اتنا خوبصورت' اتنا پرفیکٹ بیٹا کسی ماں کا ہو سکتا ہے۔۔۔سوائے میرے؟''

''پرفیکٹ۔۔۔اونہہ!'' سلمان کا لہجہ خراب ہو گیا۔

راشد کو اندازہ ہو گیا کہ سلمان کو کوئی چیز کاٹ رہی ہے۔۔۔کوئی انجانا جذبہ' کوئی دلی تکلیف۔۔۔کچھ نہ کچھ تھا ضرور۔

''یہ لڑکا محبت کے قابل نہیں ہے۔'' سلمان نے مزید کہا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہو؟''

''دیکھو صفیہ' تم میں گرم جوشی ہے۔۔۔دردمندی ہے۔۔۔زندگی ہے۔ تم ایسے سرد مزاج' پتھر جیسے بیٹے کی ماں نہیں ہو سکتیں۔ یہ تمہارا بیٹا نہیں ہو سکتا۔''

''بس کرو سلمان' راشد بہت خراب وقت گزار کر آیا ہے۔۔۔اور یہ

گھر میں اس کی پہلی رات ہے۔''

سلمان' راشد کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے چڑیا گھر میں بند کسی جانور کو دیکھ رہا ہو۔ جواب میں راشد بھی اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔

''ایک بات بتاؤ۔'' بالآخر سلمان نے پوچھا۔ ''تم اپنی ماں سے محبت کرتے ہو؟''

راشد نے سرتاپا اس کا جائزہ لیا۔ ''نہیں میرا خیال ہے' مجھے ممی سے محبت نہیں۔''

''اوہ۔۔۔میرے خدا!'' سلمان نے کہا۔

''آپ نے سوال کیا' میں نے جواب دے دیا۔''

راشد کبھی ایک بار پہلے بھی ممی سے اپنے تعلق کا تجزیہ کر چکا تھا۔ اس نے دوطرفہ دلچسپی کا تجزیہ کیا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ دونوں کے درمیان کوئی حقیقی اور پائیدار جذبہ نہیں تھا۔ اس نے جو جواب دیا تھا' وہ سچا تھا۔ اگرچہ اسے بدتمیزی پر محمول کیا جا سکتا تھا اور وہ طبعاً بدتمیز نہیں تھا۔ وہ ہرگز یہ حقیقت اس طرح نہ اگلتا۔ اس کا کریڈٹ سلمان کو جاتا تھا۔ جس نے اس طرح بلاواسطہ سوال کیا تھا۔ حالانکہ اسے یہ پوچھنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ ویسے وہ اس کے علاوہ کوئی جواب دیتا تو وہ ممی کے لیے بھی حیران کن ہوتا۔

''تم قاتل ہو۔۔۔خونی ہو۔'' سلمان غرایا۔ پھر وہ خاصی کوشش کے بعد کرسی سے اٹھا۔ ''صفیہ نے مجھے بتا دیا ہے کہ تم نے یونیورسٹی میں کیا گل کھلایا ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے دھچکا پہنچا ہے یہ جان کر۔''

ممی آزاد ہیں۔ جسے چاہیں' بتا دیں۔'' راشد نے سرد لہجے میں کہا۔ اسے یہ سوچ کر غصہ آ رہا تھا کہ سلمان کے خیال میں اس کے محسوسات کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت ہے۔

''سلمان۔۔۔تم نشے میں ہو۔ مجھے تم کو یہ بات نہیں بتانا چاہیے تھی۔'' ممی نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

''میں نشے میں نہیں ہوں۔ مجھے تکلیف ہوئی ہے۔'' سلمان نے کہا۔

''تم جیسی عورت کا بیٹا اتنا سفاک۔۔۔اتنا سرد مزاج۔۔۔اتنا بے تعلق کیسے ہو سکتا ہے۔ راشد۔۔۔ مجھے بتاؤ تم اپنی ماں سے محبت نہیں کرتے؟''

''نہیں۔۔۔ ذرا بھی نہیں۔''

سلمان نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں دبائیں ''او مائی گاڈ۔''

''میرے خیال میں یہ سب کچھ بے حد ذاتی ہے؟ آپ کا اس سے تعلق ہے؟'' راشد نے پوچھا۔

سلمان پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھا کیا۔۔۔ ڈھیر ہو گیا۔

''راشد۔۔۔ میرے نزدیک تم بیٹوں کی طرح ہو۔'' اس نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

راشد نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔ سلمان کے اپنے بھی دو بیٹے تھے۔۔۔ اور وہ ہمیشہ اس کی توجہ سے محروم رہے تھے۔ ایسے میں پرائے بیٹوں کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ تاہم اس نے کہا کچھ نہیں۔

''تم نے جو کچھ کیا' ناقابلِ معافی ہے۔'' سلمان نے کہا۔ ''تم نے اپنے دوست کو خود اس کے ہاتھوں مرنے دیا۔ میرے نزدیک تم انسان ہی نہیں رہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' راشد نے بے پروائی سے کہا۔

''مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم اپنی ماں سے محبت کرتے ہو؟ زیادہ نہیں' کم سہی۔ بہت تھوڑی۔۔۔ برائے نام سہی۔''

''مسٹر سلمان' اگر مجھے اپنی ممی سے برائے نام بھی محبت ہوتی تو تم اب

سے آٹھ سال پہلے میرے ہاتھوں مر چکے ہوتے۔'' راشد نے ایک ایک لفظ زور دیتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

سلمان کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ وہ الفاظ تھے یا بم کا دھاکا۔ لیکن صفیہ حسن کا چہرہ بے تاثر تھا۔ سلمان نے بڑی کوشش کے بعد خود کو سنبھالا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''صفیہ۔۔۔ مائنڈ نہ کرنا۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ میں کھانے پر تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔''

''ٹھیک ہے سلمان' بہتر بھی یہی ہے۔''

''مجھے افسوس ہے راشد' میں تمہارے کسی کام نہیں آ سکا۔ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکا۔'' سلمان نے جاتے جاتے کہا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ راشد نے سلمان کو بے اعتمادی کا شکار دیکھا ورنہ اس گھر میں اس کا رویہ مالکانہ ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ مسکراتا رہتا۔ دعوتوں کے دوران میں ایسا لگتا کہ میزبان وہ ہے۔ مہمانون کے مذاق پر ہنستا' ان کی خاطر تواضع کرتا۔

وہ سوچتا رہا۔ صفیہ بھی خاموش تھی۔ پھر ہاجرہ نے کھانا میز پر لگا دیا۔

کھانے کے بعد ہاجرہ فروٹ لے آئی۔

صفیہ نے راشد سے پوچھا۔ ''بیٹے۔۔۔ خدا پر تمہارا ایمان ہے؟''

''ہاں' ہے۔ میرا خیال ہے' انسان کو ایمان سے محروم نہیں ہونا چاہیے۔ اور اس کا کوئی متبادل بھی نہیں ہوتا۔''

''مولانا نصیر یاد ہیں تمہیں؟''

راشد کو مولانا نصیر یاد تھے۔ ان کا ایک مدرسہ تھا۔ جہاں بچوں کو۔۔۔لڑکوں کو دینی تعلیم دی جاتی تھی۔ ممی اور ڈیڈی وقتاً فوقتاً مدرسے کی مالی امداد کے ذریعے اپنی اپنی عاقبت سنوارتے تھے۔ اس طرح ٹیکس کے سلسلے میں بھی بچت ہو جاتی تھی۔ راشد کو باپ کی شخصیت کا یہ پہلو بہت برا لگتا تھا۔ خالص کاروباری ذہن۔۔۔منافع کی اتنی زیادہ اہمیت۔ اسے لگتا تھا کہ ڈیڈی نے کسی کاروباری مصلحت ہی کی وجہ سے ممی کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ اسی لیے انہوں نے سلمان سے بھی ایک طرح کا ذہنی سمجھوتا کر رکھا ہے۔

''جی ہاں۔۔۔یاد ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں تمہیں ان سے ملوانا چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے' وہ تمہاری مدد کر سکیں گے۔''

''ممکن ہے۔''

کھانے کے بعد وہ چہل قدمی کی غرض سے نکل آیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ جب وہ گھر سے نکل رہا تھا تو ممی اسے چھوڑنے دروازے تک آئی تھیں۔ وہ دروازہ کھول کر نکلنے لگا تو بولیں۔ ''ممی کو پپی نہیں کرو گے؟''

اس نے بڑی سعادت مندی سے جھک کر ان کی پیشانی چوم لی۔ ممی نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا اور بولیں۔ ''تم مجھ سے محبت کرو یا نہ کرو راشد میں تم سے محبت کرتی ہوں۔'' پھر ان کے لہجے میں حسرت اتر آئی۔ ''راشد۔۔۔تم مجھ سے ذرا سی محبت بھی نہیں کر سکتے؟''

اس نے نرمی سے خود کو چھڑا لیا۔ ''تکلیف دہ باتیں مت پوچھا کریں ممی!''

اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ سارہ کے گھر کی طرف نکل آیا ہے۔

سارہ اسی علاقے کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں تنہا رہتی تھی۔ وہ ہیروئن بننے کے

شوق میں گھر سے بھاگ کر لاہور چلی آئی تھی۔ فلموں میں اسے چند چھوٹے چھوٹے رول ملے۔ مگر وہ اپنے مزاج کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔ البتہ ماڈلنگ میں وہ کامیاب رہی۔ وہ بہت حسین اور متناسب الاعضاء لڑکی تھی۔ جب وہ پہلی بار ملے تو سارہ نے اپنے تمام دکھ اسے سنا ڈالے تھے۔ اس کے اندر بڑی ہی بے یقینی تھی۔ راشد کو اس کا منہ پھٹ ہونا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ بہت صاف گو تھی۔

اس وقت شاید اسے سارہ کی ضرورت تھی' تنہائی بہت زیادہ کھل رہی تھی۔

اس نے فلیٹ کی گھنٹی بجائی۔ سارہ نے پوچھا۔ ''کون ہے؟'' مگر جواب کا انتظار کیے بغیر ہی دروازہ کھول دیا۔ راشد کو دیکھتے ہی وہ کھل اٹھی۔

''ارے۔۔۔یہ تم ہو راشد' کب آئے تم؟''

''آج ہی آیا ہوں۔'' راشد نے جواب دیا۔

وہ اسے اندر لے آئی۔ اس کے بیٹھنے کے بعد وہ بولی۔ ''میں جانتی تھی۔ میری ضرورت ہی تمہیں یہاں تک لے آئی ہے۔''

''ٹھیک سمجھیں۔''

وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ ''کچھ پیو گے؟''

''ہاں چائے پلا دو۔''

وہ اس کے لیے چائے بنا لائی۔ پھر قریب بیٹھ کر اسے چائے پیتے دیکھتی رہی۔ ''مجھے تمہاری آمد سے خوشی ہوئی۔ تم بہت خوبصورت آدمی ہو۔۔۔اور میں خوبصورتی کو ترس رہی ہوں کب سے۔''

''اچھا۔'' راشد نے پیالی خالی کر کے میز پر رکھ دی۔

''روشنی بری لگ رہی ہے نا؟'' سارہ نے پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اٹھ کر لائٹ آف کر دی۔

وہ سارہ کے پاس بارہا آ چکا تھا۔ اس تعلق کی سب سے بڑی خوبی اسے یہ لگتی تھی کہ اس میں جذبات کا کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ تو بس ایک حقیقت پسندانہ تعلق تھا۔۔۔ضرورت کا تعلق۔ البتہ سارہ جو جذبات شامل کرتی تھی' وہ اوپری ہوتے تھے۔ البتہ ایک بات وہ سچائی سے کہتی تھی۔۔۔۔ وہ یہ کہ وہ اتنے لوگوں سے ملی ہے مگر آج تک اسے راشد سے اچھا کوئی نہیں ملا۔ راشد جانتا تھا کہ سارہ اس سے ڈرتی بھی ہے۔ شاید اس کی مردانہ وجاہت سے۔ مرد کو اگر اپنی کیفیات پر مکمل قابو ہو تو عورت اس سے از خود ڈرنے لگتی ہے۔ سارہ بھی راشد سے ڈرتی تھی۔

''راشد۔۔۔کیا سوچ رہے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں۔ میں سوچتا کب ہوں۔ سوچنے والا آدمی ہی نہیں ہوں میں۔''

''میں تمہیں سکون دے سکتی ہوں؟'' سارہ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''میں پرسکون ہوں۔''

سارہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے رخسار کو چھوا۔ ''راشد۔۔۔تم مجھ سے محبت کرتے ہو نا؟''

''نہیں۔''

''تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟''

راشد کچھ دیر سوچتا رہا' پھر بولا۔ ''میرا خیال ہے نہیں۔''

''لیکن انسان محبت کے بغیر زندہ نہیں رہتا۔''

''مجھے تو محبت ایک فضول سی چیز لگتی ہے۔''

''تم سے محبت کرنا ایک لاحاصل عمل ہے۔'' سارہ جھنجلا گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ جھنجلائی تھی۔

''آئی ایم سوری۔'' راشد نے کہا۔ ''لیکن یہ حقیقت ہے کہ تمہاری قربت مجھے اچھی لگتی ہے۔''

''لیکن تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟''

''ہرگز نہیں۔''

''کیوں؟'' سارہ نے پوچھا۔ وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔ لیکن جواب نہیں ملتا تھا۔ ''راشد۔۔۔ایک نہ ایک دن تم کسی سے شادی کرو گے۔'' تھک ہار کر وہ ہی بولی۔

''کیوں کروں گا؟''

''کیونکہ سب کرتے ہیں۔ تم بھی کرو گے۔ مگر اپنی بیوی سے محبت نہیں کر سکو گے۔ کیونکہ محبت تمہارے خمیر ہی میں نہیں ہے۔ بہرحال۔۔۔کبھی نہ کبھی کوئی لڑکی تمہاری طرف بڑھے گی۔ تم سے کہے گی کہ تم اس سے شادی کر لو۔ تو پہلے میں ہی کیوں نہ کہہ دوں۔'' سارہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''مجھ سے شادی کر لو راشد پلیز۔۔۔پلیز۔۔۔پلیز۔۔۔''

''تم یہ کیوں کہہ رہی ہو؟''

''اس لیے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں بہت گناہ گار ہوں لیکن ہر لمحہ میرے دل سے تمہارے لیے دعا نکلتی ہے۔ یہ وہ انسانی جذبہ ہے راشد' جسے لوگ محبت کہتے ہیں کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے؟''

راشد چند لمحے سوچتا رہا' پھر بولا۔ ''نہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا۔''

سارہ نے اپنا چہرہ تکیے میں چھپا لیا۔

راشد کھڑا ہو گیا۔ ''سنو سارہ محبت ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔ محبت میں آدمی اپنے لیے دکھنے کا۔۔۔۔چوٹ کھانے کا سامان کرتا ہے۔''

''کیسی چوٹ؟ کیسا دکھ؟'' سارہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ ''اوہ

راشد۔۔۔۔تمہیں محبت نے بہت دکھ پہنچائے ہیں؟ بہت زخم دیے ہیں۔'' اس نے راشد کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

راشد تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ''مجھ پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے محبت کبھی دکھ نہیں دے سکتی۔ اس لیے کہ میں نے یہ راز پہلے ہی جان لیا تھا۔ میں نے کبھی محبت کی ہی نہیں۔ دکھ کیا ملتا۔''

''تم جا رہے ہو؟'' سارہ نے اسے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں' جانا تو ہے۔''

''پھر آؤ گے؟'' سارہ کے لہجے میں خوف تھا۔

''ضرور۔'' راشد نے ہموار لہجے میں کہا۔ ''گڈ نائٹ۔'' پھر وہ فلیٹ سے نکل آیا۔

صبح ٹھیک آٹھ بجے وہ ناشتے کی میز پر موجود تھا۔ وہ ایک غیر تحریری ضابطہ تھا۔ کھانا ساتھ کھایا جائے یا نہ کھایا جائے' ناشتا بہر حال ساتھ کیا جاتا تھا۔۔۔ٹھیک آٹھ بجے۔ ناشتے کی میز پر خاموشی رہی۔ ممی اس سے نظریں چراتی رہیں۔

ناشتے کے بعد اس نے پرس جیب میں ڈالا اور ٹہلتا ہوا اس پیٹ شاپ کی طرف چل دیا۔ جو گھر سے کچھ دور تھی۔ سڑک پر کافی چہل پہل تھی۔ لوگ اپنے اپنے کام پر جا رہے تھے۔ کچھ کے ہاتھ میں ٹفن کیریئر بھی تھے۔ ہر شخص جلدی میں معلوم ہوتا تھا لیکن راشد کو ہر چہرہ نقاب جیسا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے مضامین میں

نفسیات کا انتخاب اسی لیے کیا تھا کہ وہ نقابوں کے پیچھے چھپے اصل چہرے دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے چہرے دیکھنے میں بڑی دلچسپی تھی۔

پیٹ شاپ میں زیادہ تر پرندے تھے۔ لیکن ایک کینل میں اچھی نسل کے چھوٹے چھوٹے پلے بھی تھے۔ وہ بہت صحت مند لگ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں چمکیلی تھیں۔ اس نے شاپ کے مالک سے بات کی اور پلوں کو بغور دیکھتا رہا۔ ایک کوکر اسپینیل اسے بہت اچھا لگا۔ وہ تین ماہ کا رہا ہوگا۔ اس کی براؤن آنکھوں سے ذہانت ہویدا تھی اور کھلنڈرا بھی معلوم ہو رہا تھا۔ شاپ کے مالک نے اسے یقین دلایا کہ اس کا انتخاب بہترین ہے۔

اس نے قیمت ادا کی۔ دکاندار نے پٹا اور زنجیر تحفتاً پیش کی۔ شاید پلے کی قیمت اس نے زیادہ ہی وصول کر لی تھی۔ لیکن پلے کو پٹا پسند نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بھرپور مزاحمت کی۔ لیکن بالآخر راشد اسے باندھنے میں کامیاب ہو گیا۔

جیسے ہی وہ پلے کو لے کر سڑک پر آیا۔ پلا بری طرح خوفزدہ ہو گیا اور اکڑ کر بیٹھ گیا۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ وہ سڑک پر چلا تھا۔ بھیڑ بھاڑ اور ٹریفک کا شور اس کے لیے باعثِ دہشت ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اس کا عادی نہیں تھا۔ وہ اپنے قریب سے گزرتی ہوئی ٹانگوں اور پیروں کو خوفزدہ نظروں سے دیکھتا اور سمٹ جاتا۔ راشد نے اس عالم میں اس کی چند تصویریں لیں۔ پلا دکان میں واپس جانے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ اس کے خود چلنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ راشد کو اسے گھسیٹ کر گھر تک لے جانا پڑا۔

راشد کو مدتوں سے ایک اچھا کتا پالنے کی آرزو تھی۔ پچھلے کتے کی موت کے بعد سے یہ تڑپ اس کے اندر موجود تھی۔ پچھلے کتے کے اور اس کے درمیان محبت اور اعتبار کا ایک عجیب تعلق موجود تھا جس سے وہ کتے کی موت کے بعد محروم ہو گیا تھا۔ اسے وہ تعلق بے حد عجیب لگتا لیکن وہ کوشش کے باوجود کبھی اسے جھٹک

نہیں سکا۔۔۔۔ اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ یہ خیال برسوں اس کے ذہن سے چپکا رہا۔ وہ اپنی جذباتیت پر خود بھی ہنستا۔۔۔۔ اس کا مذاق اُڑاتا تھا۔ لیکن اس سے فرق کچھ بھی نہیں پڑتا۔ کتے کی موت کے فوراً بعد اس نے یہ وتیرہ بنا لیا کہ بڑی بہادری اور بے رحمی سے کتے کی موت کو مزاحیہ پیرائے میں بیان کرتا۔ لیکن اس کے اندر کی فضا پر جو سوگ طاری تھا' اس کی سنگینی کم نہ ہوئی۔ وہ ایک اور کتے کی آرزو کرنے لگا۔

اس نے اپنی اس کمزوری کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اداسی جو کتے کی موت کا نتیجہ تھی' برسوں بعد بھی قائم رہی۔ اور وہ بھی تجزیے کی کوشش میں لگا رہا۔ وہ ہر جذباتی تعلق کو اپنے ذہن میں واضح دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے اور دوسرے انسانوں کے درمیان کوئی گڑبڑ۔۔۔۔ کوئی فرق ضرور ہے۔ کتے کی محبت پر وہ اعتبار کر سکتا تھا۔ وہ کئی بار یہ بات کہہ چکا تھا کہ وہ انسانوں پر جانوروں کو ترجیح دیتا ہے۔ اس نے اس کا تجزیہ بھی کیا۔ درحقیقت کتا اس کی محبت سے بے نیاز تھا۔ وہ کوئی مطالبہ نہیں کرتا تھا۔ وہ راشد کے آگے پیچھے پھرتا۔ اچھل کر اس کی گود میں چڑھ جاتا۔ وہ زبان سے اس کا جسم چاٹتا۔ کتے نے کبھی اپنی محبت اس سے چھپائی نہیں تھی۔ نہ کبھی اسے اس پر غصہ آیا تھا نہ اس نے کبھی اس سے نفرت کی تھی۔۔۔۔ اور نہ ہی کبھی منہ پھیرا تھا۔ اس نے کبھی بے وفائی بھی نہیں کی تھی۔ وہ غیر مشروط طور پر اس کا وفادار تھا۔۔۔۔ اور اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کی محبت میں سرد مہری تھی نہ دوری' نہ کوئی اذیت' کبھی کبھی وہ اسے زیادہ توجہ اور محبت دے کر بگاڑ دیتا۔ مگر ذرا سی دیر میں وہ بگاڑ دور ہو جاتا۔ ایک ہلکی سی ڈپٹ۔۔۔۔ یا ہلکا سا دھپ اسے سیدھا کر دیتا۔ کتا پھر ٹھیک ہو جاتا۔ لوگوں سے محبت میں یہ ممکن نہیں تھا۔

وہ گھر پہنچا تو بارش شروع ہو چکی تھی۔ وہ کتے کو اپنے کمرے میں لے گیا

اور فوراً ہی اس کی تربیت شروع کر دی۔ اس نے کتے کا نام ٹامی رکھا۔ واپس آتے ہوئے اس نے بسکٹ کا ایک ڈبا اور گوشت خریدا تھا۔ اوپر آنے سے پہلے اس نے گوشت ہاجرہ کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اسے ابال دے۔

پہلے اس نے پلے سے سخت گفتگو کی' اُسے ڈانٹا۔ پھر اخبار کا رول بنا کر اس کی ہلکی ہلکی پٹائی کی۔ وہ کتے کو نروس کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔ اور ذرا ہی دیر میں وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ ٹامی خوفزدہ ہوا تو اس کے اندر اپنے آقا کو خوش کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اب بس اس کی رہنمائی باقی تھی۔ ٹامی اس کے اشاروں کے مطابق ردِعمل ظاہر کرنے لگا۔ جلد ہی وہ اپنے نام سے آشنا ہو گیا۔

شام تک وہ تربیتی کورس چلتا رہا۔ راشد نے ٹامی کو ساکٹ میں سے پلگ نکالنا سکھا دیا۔ راشد انعام کے طور پر اسے بسکٹ یا ابلے ہوئے گوشت کی ایک بوٹی دیتا۔ ایسے میں ننھا پلا اسے ممنونیت اور محبت سے دیکھتا۔ اس کے انداز میں والہانہ پن تھا۔

شام تک ٹامی نے سیکھ لیا کہ آقا کو کس طرح خوش کیا۔۔۔۔ اور خوش رکھا جا سکتا ہے۔ کس طرح انعام حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اب وہ احکامات کو سمجھنے اور ان کے مطابق ردِعمل ظاہر کرنے کا اہل ہو گیا تھا۔ شروع میں پلا 'ٹامی' اور 'بیٹھو' میں گڑبڑ کر رہا تھا۔ مگر رول کیے ہوئے اخبار کی چند ضربوں نے وہ کنفیوژن بھی دور کر دیا۔ شام تک ٹامی تھک گیا۔۔۔۔ اور اونگھنے لگا۔

ساڑھے پانچ بجے ہاجرہ چائے اور بسکٹ لے آئی۔ اس رات بھی گھر میں دعوت تھی۔ ممی نے اسے بتا دیا تھا۔ حسبِ معمول اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ کھانا اپنے کمرے میں کھائے گا۔ ممی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ بلکہ وہ زیادہ مطمئن نظر آنے لگی تھیں۔

دعوتوں کا یہ سلسلہ تو مدت سے چل رہا تھا۔ اور وہ لڑکپن ہی سے ان سے

گریزاں رہا تھا۔ اسے لوگوں میں گھلنا ملنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ تقریباً تمام لوگ اوپری دل سے ملتے تھے اور سطحی گفتگو کرتے تھے۔ دعوت میں شریک ہونے کا جواز سب کے پاس موجود تھا اور عموماً وہ جواز کاروباری ہوتا۔ ایسی دعوتوں میں تعلقات بنتے تھے۔ لوگ ایک دوسرے کو اپنے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرتے۔۔۔۔ اور کہیں نہ کہیں خود بھی استعمال ہو جاتے تھے۔

راشد کو معلوم تھا کہ آج کی دعوت میں ڈیڈی شریک نہیں ہوں گے۔ میزبانی کے فرائض سلمان اور ممی مل کر انجام دیں گے۔ ڈیڈی کو ساڑھے نو بجے کی فلائٹ سے آنا تھا۔ گویا گھر پہنچتے پہنچتے انہیں دس بج جاتے۔ بشرطیکہ فلائٹ وقت پر پہنچتی، جس کا امکان کم ہی تھا۔

راشد نے کھانا اپنے کمرے میں ہی کھایا۔ پھر وہ موسیقی کا کیسٹ لگا کر سنتا رہا۔ اس کے بعد وہ کھڑکی میں کھڑا ہوا۔ پھوار اب بھی پڑ رہی تھی۔ اجالے کے پیش منظر میں ننھی منی بوندیں چاندی کے تاروں جیسی لگ رہی تھیں۔ سیاہ سڑک یوں چمک رہی تھی جیسے اس کے اوپر شیشہ بچھا دیا گیا ہو۔ پھر اس کی پلکیں بھاری ہونے لگیں۔ اس نے ٹامی کو جگایا اور چہل قدمی کے لیے چل دیا۔ پارٹی سے بچنے کے لیے وہ عقبی دروازے سے نکلا۔ تھوڑی ہی دور چلنے کے بعد اس کے کپڑے بھیگ گئے۔ ٹامی اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ راہ میں ایستادہ درخت بارش میں دھل کر چمکدار ہو گئے تھے۔ قریب سے بھری ہوئی ٹیکسیاں گزر رہی تھیں۔ پیدل چلنے والا کوئی نہیں تھا۔

جب اسے اندازہ ہوا کہ ٹامی تھک گیا ہے تو گھر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اس نے ٹامی کو گود میں اٹھا لیا۔ کیونکہ ٹامی سے اب چلا نہیں جا رہا تھا۔ ٹامی اس کے سینے سے لگا کپکپاتا رہا۔ گھر پہنچ کر اس نے ٹامی کو خشک کیا اور خود بھی گرم پانی سے نہایا۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور ٹامی کو گود میں لے کر بیٹھ گیا۔

پھر اس نے تھامس مین کی مختصر کہانیوں کا مجموعہ اٹھایا اور پڑھنے لگا۔ ٹونیو کروگر نامی کہانی اسے اچھی لگی۔ اسے خود فوٹو گرافی سے عشق تھا۔ لیکن اس نے کبھی خود کو آرٹسٹ نہیں سمجھا تھا۔ کہانی کا مرکزی کردار کروگر ایسا ہی شخص تھا جسے فوٹو گرافی سے عشق تھا۔ اس عشق پر کئی برس صرف کرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس چکر میں وہ ان لوگوں سے دور ہو گیا ہے، جن سے محبت کرتا تھا۔ انہیں گنوا بیٹھا ہے۔ وہ ان سے ملنے کے لیے تڑپنے لگا۔ پھر راشد کہانی کے اس موڑ پر پہنچا جہاں کروگر نے فیصلہ کیا کہ وہ ٹوٹے ہوئے تعلقات دوبارہ استوار کرنے کی خاطر سب کچھ چھوڑ سکتا ہے۔۔۔۔ ہر چیز سے دست بردار ہو سکتا ہے۔ وہاں تک پڑھنے کے بعد کہانی میں راشد کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ اس کے لیے یہ حماقت ناقابلِ یقین تھی کہ ایک ایسا شخص جو ایک فن میں کمال حاصل کرنے والا ہے، محض لوگوں سے ملنے کی آرزو میں اس فن کو لات بھی مار سکتا ہے۔ تھامس مین نے ایک تنہائی زدہ شخص کو لفظوں میں پینٹ کیا تھا۔ اور اس صورت میں راشد کو اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے نزدیک تنہائی انسان کے لیے قوت کا منبع تھی۔ لیکن اگر کوئی شخص خود کو تنہا سمجھ کر خود رحمی میں مبتلا ہو جائے تو وہ کمزوری بن جاتی تھی۔ اور ایسے جذبے کو عظیم ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس نے کہانی ختم کی ہی تھی کہ راہداری میں قدموں کی چاپ ابھری۔ وہ سمجھ گیا کہ ڈیڈی آ رہے ہیں۔ ڈیڈی پہلے ہی جیسے تھے۔ خوبرو، باوقار اور خوش لباس۔ لیکن وہ ڈیڈی کی نجی زندگی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ ان کی سلمان سے دوستی تھی اور جو کچھ ہو رہا تھا، اس کی انہیں کچھ پروا بھی نہیں تھی لیکن ان کا اپنا بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ ہر سال ڈیڑھ دو مہینے کے لیے وہ کہیں غائب ہو جاتے۔۔۔۔ اور اس کا تعلق کام سے نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان کا عرصۂ تفریح تھا۔ راشد کو شک تھا کہ اس عرصے میں وہ بھی رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ اسے احساس تھا

کہ وہ ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ لیکن اسے کسی کمی کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔

''ہیلو ڈیڈی!'' اس نے اٹھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ ''پارٹی ختم ہوئی یا نہیں؟''

''پارٹی! مجھے تو نیچے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ تمہاری ممی اپنے کمرے میں جا چکی ہیں۔ میری فلائٹ ڈیڑھ گھنٹا لیٹ تھی۔'' نوید حسن نے جیب سے ایک خط نکال کر بیٹے کی طرف بڑھایا۔ ''یہ پڑھ لو۔''

راشد نے لفافہ چاک کر کے خط نکالا۔ لفافے پر یونیورسٹی پوسٹ آفس کی مہر تھی۔ خط وائس چانسلر کے لیٹر ہیڈ پر تحریر کیا گیا تھا۔

ڈیئر مسٹر حسن

آپ کے بیٹے کی تحریری درخواست ہمارے پاس ہے جس میں اس نے یونیورسٹی چھوڑنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے اس سلسلے میں آپ سے اجازت لے لی ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ وہ یونیورسٹی چھوڑ چکا ہے۔۔۔۔اور ہمیں امید ہے کہ اب تک بخیریت گھر پہنچ چکا ہوگا۔

یہ بتانا ضروری ہے کہ اس کے اس فیصلے کا تعلق اس کے روم میٹ اور دوست مظفر ملک کی موت سے ہے۔ آپ کو یقیناً علم ہوگا کہ آپ کے بیٹے نے اتوار کی شام ساڑھے چار بجے پولیس کی مدد طلب کی تھی۔ پولیس والے آئے تو انہوں نے آپ کے بیٹے کو کمرے میں پایا۔ اس کا ساتھی مظفر ملک اس وقت تک مر چکا تھا۔ اس نے بلیڈ سے اپنی دونوں کلائیاں کاٹ لی تھیں۔ آپ کے بیٹے نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ مظفر ملک نے خودکشی سے پہلے اپنا ارادہ اس پر ظاہر کیا تھا۔ لیکن اس نے اس کی حوصلہ شکنی کی نہ حوصلہ افزائی۔ بلکہ جس دوران میں مظفر نے اپنی کلائیاں کاٹیں وہ اسی کمرے میں موجود مطالعہ کرتا رہا۔

پولیس کے استفسار پر آپ کے بیٹے نے کئی بار یہ کہا کہ مظفر آزاد انسان تھا۔ اور اسے اپنے بارے میں آزادی سے فیصلہ اور اس پر عمل درآمد کرنے کا حق تھا۔ اور یہ کہ اسے مظفر کو باز رکھنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

یونیورسٹی میں آپ کے بیٹے کی تعلیم اور کھیل کے میدان میں کارکردگی کا ریکارڈ نہایت اعلیٰ رہا ہے وہ اپنے ساتھی طلبا میں مقبول بھی ہے۔ ہم اس ہونہار طالب علم سے تعلق توڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ واپس آنے کا خواہاں ہو تو ہمیں خوشی ہوگی۔ لیکن اس نے ہمارے ماہرِ نفسیات ڈاکٹر حشمت کو زیادہ وقت نہیں دیا کہ وہ اس کا کیس سمجھ سکتے۔ تاہم ان کا خیال ہے کہ آپ کے بیٹے کو کسی ماہرِ نفسیات کی رہنمائی اور مدد کی ضرورت ہے۔

اگر آپ کو اس سلسلے میں معلومات درکار ہوں اور آپ یہاں آسکیں تو ہمیں آپ کی مدد کر کے مسرت ہوگی۔ پولیس رپورٹ اور اس ناخوشگوار واقعے کے سلسلے میں مکمل ریکارڈ آپ کو دکھایا جا سکتا ہے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ
راحت وسیم وائس چانسلر

''تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟'' نوید حسن نے بیٹے سے پوچھا اور اس کے بیڈ پر نیم دراز ہو گئے۔ راشد کو کچھ حیرت ہوئی۔ اس نے انہیں کبھی یوں ڈھیر ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

''آپ کیسے ہیں ڈیڈی؟'' اس نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کا سفر کیسا رہا؟''

''بہت اچھا۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''سنو راشد۔۔۔۔قانونی طور پر تم سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا۔ لہٰذا تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''اور قانون سے ہٹ کر؟''

''میرا خیال ہے' تم نے شوپنہار کو بکثرت پڑھا ہے؟''

''جی ہاں۔'' راشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں وجود کے بارے میں تم جس طرزِ عمل کا اظہار کر رہے ہو' وہ حقیقی نہیں ہے اور لوگوں نے اس سلسلے میں سوچا ہے۔۔۔۔ اور اسے اختیار بھی کیا ہے۔ میرے خیال میں تمہیں ان افکار کو آزمانے کا حق ہے' جو تمہارے خیال میں اس قابل ہیں۔''

راشد ٹامی کے کان سہلاتا رہا۔ ٹامی سو چکا تھا۔ ''کیا آپ کے خیال میں مجھے ماہرِ نفسیات کی مدد کی ضرورت ہے؟''

''جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ تمہیں برے اور بھلے کی تمیز نہیں ہے' قانونی طور پر تم ہوش مند انسان ہو۔ یہ ہوش مندی کی بے حد غیر معقول تعریف ہے۔ تمہارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تمہیں اسے خودکشی سے روکنے کا حق نہیں تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ تمہیں اس حق کا علم نہیں تھا۔ لیکن اس سلسلے میں ایک عام جذباتی آدمی کا نقطۂ نظر یقینی طور پر یہی ہوگا کہ تم غلطی پر تھے۔ تم سے اخلاقی جرم سرزد ہوا۔''

راشد کچھ دیر انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے اپنا سوال دہرایا۔ ''مجھے ماہرِ نفسیات کی مدد کی ضرورت ہے یا نہیں؟''

''میرے خیال میں ہر شخص کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر تم چاہو تو مل لو۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں۔''

''اب یونیورسٹی تو تم چھوڑ چکے۔ آگے کیا ارادہ ہے؟''

''مجھے کچھ معلوم نہیں۔ فی الوقت میرا کوئی ارادہ نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ سکون سے رہو اور سوچو۔ میرے ساتھ اسکواش کھیلو۔ میں تمہیں اپنے دوستوں سے ملواؤں گا۔'' نوید حسن اٹھ کھڑے ہوئے۔

''او کے ڈیڈی!''

''یہ کتا کہاں سے آیا؟'' انہوں نے ٹامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آج صبح ہی خریدا ہے۔''

''اچھا بیٹے۔۔۔۔ گڈ نائٹ۔''

ڈیڈی نے اسے کلب میں مدعو کیا تھا۔ انہوں نے اسے بہت سے دوستوں سے ملوایا۔ ان لوگوں نے خوش مزاجی سے اس سے رسمی گفتگو کی اور پھر اپنی باتوں میں لگ گئے۔ ان کا پسندیدہ موضوع کاروبار تھا۔ راشد جانتا تھا کہ وہ اس سے کیا توقع کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ ان کی باتیں توجہ سے سنے اور کاروباری اسرار و رموز کو سمجھے۔

اس نے ڈیڈی کو دوسروں سے بات چیت کرتے بھی دیکھا۔ اسے احساس ہوا کہ جن لوگوں سے اس کے ڈیڈی کا کاروباری تعلق ہوتا ہے' وہ انہیں آر پار دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہیں ان کی کمزوریاں ذرا دیر میں معلوم ہو جاتی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کب کون اپنے موقف پر ابتدا میں سختی سے ڈٹنے کے بعد اچانک پسپا ہو جائے گا۔ اور کون غلطی پر ہونے کے باوجود اڑا رہے گا۔ کس پر بچوں کی طرح قابو پایا جا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ ان کے لیے بے حد سادہ و آسان تھا۔۔۔۔ ریاضی کے سوالوں کی طرح۔

پھر وہ اسکواش کھیلنے چلے گئے۔ راشد نے نوید حسن کو ایک پوائنٹ بھی نکل لینے دیا۔ نوید حسن پورے کورٹ میں دوڑتے رہے۔ یہ نہیں کہ کھیل

کے۔۔۔۔ اور تکنیک کے اعتبار سے وہ کمزور ہوں۔ لیکن راشد تو ناممکن قسم کی ریٹرن بھی بڑے آرام سے دے رہا تھا۔ انہوں نے کھیل شروع کرنے سے پہلے راشد سے کہہ دیا تھا کہ وہ یقینی طور پر جیتیں گے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے بہت خوبصورت ڈراپ شاٹ کھیلے لیکن راشد کے پاس جیسے ہر شاٹ کا جواب تھا۔ راشد اتنی آسانی سے اور اتنے وقار سے کھیل رہا تھا کہ اسکواش جیسا سخت کھیل بھی آسان نظر آ رہا تھا۔

پھر نوید حسن نے چیلنج کیا کہ وہ کم از کم ایک پوائنٹ ضرور لیں گے۔ مگر سر توڑ کوشش کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ راشد کو اس سے غرض نہیں تھی کہ اس کے مقابل کون ہے۔ کھیل کی حرمت کے علاوہ کھیل کے دوران میں اسے کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔ اسے ایک لمحے کو بھی خیال نہ آیا کہ اس کا باپ اب بری طرح ہانپ رہا ہے۔ اس کی ٹانگیں جواب دے رہی ہیں۔ وہ تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ ڈیڈی کو اس سے بہتر کھیلنا چاہیے۔

کھیل کے اختتام پر نوید حسن نے کہا۔ ''اچھی ایکسرسائز ہو گئی۔ ہمیں کھیلتے رہنا چاہیے۔''

وہ باہر نکلے۔ نوید حسن کو حیرت تھی کہ راشد نہ تو پسینے میں نہایا ہوا تھا اور نہ ہی اس کی سانسیں خفیف سی بھی ناہموار تھیں۔

راشد نے اس کے بعد کبھی ان کے ساتھ اسکواش نہیں کھیلی تاہم وہ ہفتے میں کم از کم تین دن کلب ضرور جاتا اور دو تین گھنٹے ورزش کرتا۔ لیکن ٹینس یا اسکواش کے لیے اسے پارٹنر مشکل ہی سے ملتا تھا۔

منگل کو مولانا نصیر سے ملاقات ہوئی۔ مولانا بڑے نرم خو اور بے حد نرم گفتار تھے۔ ان کی شخصیت ذہن پر بے حد خوشگوار اثر مرتب کرتی تھی۔ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر مولانا نے کہا۔ ''بیٹے۔۔۔۔ یونیورسٹی میں

تمہارے ساتھی کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا' اس کے متعلق تمہاری ماں نے مجھے بتایا ہے۔ میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہم تمہاری پوزیشن سمجھتے ہیں۔ خوف ایک فطری چیز ہے۔ بعض اوقات بڑے مضبوط لوگ بھی خوف کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ اور خوف انسان کو مفلوج کر دیتا ہے۔ تمہیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے تھا۔ مگر تمہیں موقع ہی نہیں ملا۔ خوف نے تمہیں کچھ کرنے نہیں دیا۔ تم ویسے بھی نوجوان ہو۔ یہ ملعون تو پختہ لوگوں کو بھی لرزا دیتا ہے۔ لیکن بیٹے' میں ایک چیز یاد دلانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ دوسروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف کی طرح محسوس کرنا چاہیے۔ انہیں اس سے بچانے کی۔۔۔۔ ان کا دکھ بانٹنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اگر وہ کوئی غلطی کریں تو انہیں ٹوکو۔ یہ کبھی نہ بھولو کہ خدا کے فضل و کرم سے تم مسلمان پیدا ہوئے ہو۔ تمہیں خدا کے احکامات کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے۔ قرآن پاک کا مطالعہ کرو۔ نماز قائم کرو پھر کوئی خوف تمہیں چھو بھی نہیں سکے گا۔'' مولانا یہ سب کہہ کر بہت پرسکون ہو گئے۔

راشد کو وہ بہت اچھے لگے۔ انہوں نے جو کچھ کہنا تھا' اس کے لیے وہ تیاری کر کے آئے تھے۔ اور وہ سچ مچ اسے اپنی ذمے داری سمجھتے تھے۔ لیکن دوسروں کی طرح صرف ظاہری طور نہیں۔ وہ اپنے طور پر اس کے احساسِ جرم کے لیے مرہم لے کر آئے تھے۔ یہ الگ بات کہ وہ خود نہ اپنے آپ کو مجرم سمجھتا تھا اور نہ ہی اسے کوئی احساسِ جرم تھا۔

راشد انہیں رخصت کرنے دروازے تک گیا۔ ''راشد۔۔۔۔ تم کبھی ہمارے مدرسے میں بھی آؤ۔ وہاں تم جیسے نوجوانوں کی تعداد بھی کم نہیں۔'' مولانا نے کہا۔

"جی حضرت۔۔۔۔ میں ضرور آؤں گا۔"

مولانا نے اس سے ہاتھ ملایا اور سلام کر کے رخصت ہو گئے۔

سمیرا کا خط جمعرات کی شام کو موصول ہوا۔ راشد کہیں گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو وہ خط اسے اپنے کمرے میں میز پر رکھا ملا۔ خط پر یونیورسٹی کا پتا لکھا تھا۔ یونیورسٹی والوں نے وہ پتا کاٹ کر اس کی جگہ اس کے گھر کا پتا لکھ دیا تھا۔

اس نے خط کھول کر پڑھا

"مسٹر راشد نوید!"

مجھے تم سے نفرت ہے۔ میرا بھائی مظفر اچھا لڑکا تھا۔۔۔۔ خوش مزاج۔ اسے لمبی عمر گزارنے کا حق تھا۔ اسے بہت عرصے جینا تھا۔ لیکن وہ یقیناً شیطانی صحبت اور اثرات کا شکار ہوا ہوگا۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم شیطان ہو۔ جو شخص اپنی موجودگی میں اپنے عزیز ترین دوست کو کلائیاں کاٹنے دے۔۔۔۔ ایسے سُست روی سے قدم قدم موت کی طرف بڑھتا دیکھے۔۔۔۔ اور کچھ نہ کرے، وہ شیطان ہی ہوسکتا ہے۔۔۔۔ برائی کا نمائندہ!

مجھے امید ہے کہ اس کی اذیت ناک یاد کبھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ مجھے امید ہے کہ جو کچھ تم نے کیا ہے، وہ تمہیں تباہ و برباد کر کے رکھ دے گا۔ مجھے امید ہے کہ تم تاابد جہنم کی آگ میں جلو گے۔"

سمیرا ملک

راشد نے خط تہ کر کے لفافے میں رکھا اور لفافہ میز پر رکھ دیا۔ پھر اس نے نامی کو گود میں اٹھایا اور اسے اگلا سبق دینے لگا۔ نامی بہت تیزی سے سیکھ رہا

اب وہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا سیکھ گیا تھا۔ وہ راشد کو خوش کرنے اور انعام ن جیتنے کا شدت سے خواہاں تھا۔ راشد نے دو گھنٹے نامی پر صرف کیے۔ پھر ا خط دوبارہ پڑھا۔ پھر اس نے میز کی دراز سے سمیرا کی تصویر نکالی جو مظفر امان سے نکلی تھی۔ وہ دیر تک خط اور تصویر سامنے رکھے انہیں دیکھتا رہا جیسے تحریر رے کے نقوش کو یکجا کر رہا ہو۔

اس رات اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مظفر کے گھر والوں کو قریب سے دیکھنا، انا چاہتا ہے۔ لفافے پر سمیرا کا پتا درج تھا۔ خط مری سے پوسٹ کیا گیا یہ سال کا وہ حصہ تھا جب مری کا ماحول اپنے شباب پر ہوتا ہے۔ اس عرصے اں عام طور پر بڑے لوگوں کو ہجوم رہتا تھا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو تے تھے کہ مری میں خوشگوار ترین وقت ماہ اگست ہی ہوتا ہے۔ تاہم وہاں جون جیسی بھیڑ نہیں ہوگی۔

اس نے سوچا، اپنی اصلیت چھپانا کچھ دشوار نہیں ہوگا۔ اب اسے صرف ت اور جزئیات طے کرنا تھیں۔

لیکن اس کی سمجھ میں اپنی اس خواہش کا جواز نہیں آ رہا تھا۔ وہ سمیرا کی اس طرح کیوں کھنچ رہا ہے، یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ پہلی ۔۔۔ زندگی میں پہلی بار وہ بغیر سمجھے بوجھے اپنی کسی خواہش پر عمل کر رہا تھا۔

سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ اپنا بینک اکاؤنٹ مری کے بینک میں کروا دیا۔ وہ جیب خرچ سے کچھ زیادہ رقم نہیں بچاتا رہا تھا۔ لیکن ایک سال ڈ کے ذریعے اس کا ایک لاکھ روپے کا انعام نکلا تھا۔ اس میں سے اس نے رچ نہیں کیا تھا۔

اس نے اپنا سامان پیک کیا۔ نامی کے لیے ایک سوٹ کیس میں سوراخ کر ہوا کا بندوبست رہے۔ پھر وہ مری کے لیے روانہ ہوگیا۔

مری میں اختر ملک کا بنگلہ اس حصے میں تھا جہاں ہر سال موسم گرما میں تفریح کی غرض سے آنے والوں کے بے شمار بنگلے تھے۔ اس علاقے میں ایک اعلیٰ درجے کا ہوٹل بھی تھا۔ مری پہنچتے ہی راشد نے اس ہوٹل کا رخ کیا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے نیچے ایک عام سے ہوٹل میں سستا سا کمرا لے لیا۔ اسے اپنی شخصیت بھی چھپانا تھی۔ اس نے اپنا نام راشد حسن لکھوایا تھا۔

ہوٹل میں سامان رکھنے کے بعد اس نے ٹامی کو لیا اور ٹہلتا ہوا اس طرف چل دیا جہاں اختر ملک کا بنگلہ تھا۔ وہ بنگلے کے سامنے سے گزرا۔ بنگلے کے گیٹ پر اختر ملک کی نیم پلیٹ لگی تھی۔ تمام بنگلے تقریباً ایک جیسے تھے۔ اندر دیوار کے ساتھ درخت لگے تھے۔

ایک چکر لگانے کے بعد وہ قریبی ہوٹل کی طرف چل دیا۔ ہوٹل کے ریستوران میں اس نے چائے پی۔ پھر کاؤنٹر پر کھڑے شخص سے گفتگو کی۔ وہ شخص ہوٹل کا مالک تھا۔ اس کا نام رزّاق خان تھا۔ باتوں ہی باتوں میں راشد نے اسے بتایا کہ وہ طالب علم ہے اور تفریح کی غرض سے آیا ہے۔

''کچھ عرصے کے لیے کوئی کام مل سکتا ہے؟'' راشد نے پوچھا۔

''اب تو سیزن ختم ہی ہونے والا ہے۔ بہر حال کام مل سکتا ہے۔ گھڑ سواری آتی ہے تمہیں؟'' رزاق خان نے پوچھا۔

''جی ہاں' مگر کام کی نوعیت کیا ہوگی؟''

''پہلے تمہیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تمہیں گھڑ سواری آتی ہے۔'' رزّاق خان نے کہا۔ پھر وضاحت کی۔ ''صاحب لوگوں کے بیٹے بیٹیاں گھڑ سواری کرنا چاہتے ہیں۔ ہم انہیں گھوڑے اور گھڑ سوار فراہم کرتے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے بیشتر کو گھڑ سواری نہیں آتی۔''

راشد کو خاصی مایوسی ہوئی۔ رزّاق خان کو اس کے چہرے سے اس کی

مایوسی کا اندازہ ہوگیا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''ہم تنخواہ معقول دیتے ہیں۔ رہائش اور کھانا الگ۔۔۔۔ ہوٹل کی طرف سے۔''

''یہ بات نہیں۔''

''اور کام بڑا دلچسپ ہے۔'' رزّاق خان نے بائیں آنکھ دبا کر کہا۔ ''تم خوبصورت ہو۔ اسی لیے تو میں تم کو رکھ رہا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' راشد سے اپنی حیرانی چھپائی نہیں گئی۔

''یہ صاحبوں کا لڑکی لوگ شہری ہوتے ہیں نا۔ بہت آزاد ہوتے ہیں۔ گھڑ سواری سے زیادہ گھڑ سوار میں دلچسپی لیتے ہیں۔ میرے پاس ایک مقامی لڑکا ہے۔۔۔۔ بہت خوبصورت ہے وہ۔ شمشیر نام ہے۔ شہر کے کالج میں پڑھتا ہے۔ ہر سال گرمیوں میں یہاں آتا ہے تو میرے لیے کام کرتا ہے۔ اس کے چکر چلتے ہیں۔ لڑکیوں سے دوستی ہو جاتی ہے۔ پیسے الگ۔ مجھے بھی فائدہ ہوتا ہے۔''

راشد کو اچانک کام میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ اس نے سوچا' اس طرح اختر ملک کو قریب سے دیکھنے اور اس سے ملنے کا موقع بھی مل سکتا ہے۔ وہ بھی یقیناً یہاں آتی ہوگی۔ پھر بھی تصدیق ضروری تھی۔ ''بنگلے والے بھی آتے ہیں یہاں گھڑ سواری کے لیے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔۔ سبھی آتے ہیں۔ مگر اس وقت بیشتر بنگلے خالی پڑے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے معاوضہ کیا ملے گا؟''

''پہلے گھڑ سواری کر کے دکھاؤ۔''

رزاق خان اسے ہوٹل سے ملحق اصطبل کی طرف لے گیا۔ اس نے ایک گھوڑے پر زین ڈالی اور باگیں راشد کو تھما دیں۔ ''یہ سامنے میدان ہے۔ اس

میں اپنے جوہر دکھاؤ۔'' اس نے ہوٹل کے سامنے والی سرسبز ڈھلان کی طرف اشارہ کیا۔

رزاق خان راشد کی گھڑسواری سے مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے ہوٹل کے ایک کمرے کی چابی راشد کو دے دی۔ ایک ماہ کا معاوضہ دو ہزار روپے طے پایا۔ کام کے اوقات صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک تھے۔

''اب شمشیر کو مقابلہ کرنا پڑے گا۔'' رزاق خان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''پہلے ہر لڑکی صرف اسی کے ساتھ گھڑسواری کرنا چاہتی تھی۔''

راشد اپنا سامان نیچے والے ہوٹل سے اٹھا لایا۔ ٹامی کی موجودگی پر کسی کو اعتراض نہیں تھا۔

شام کو اس کی ملاقات شمشیر سے ہوئی۔ شمشیر کی عمر اکیس بائیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ طویل القامت اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ لڑکیاں یقیناً اس پر منڈلاتی ہوں گی۔ لیکن راشد کو اندازہ ہوا کہ وہ ذہین نہیں ہے۔ وہ مسکراتا تو چالاک لگتا۔ ویسے اس کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔

ان کی ملاقات راشد کے کمرے میں ہوئی۔ شمشیر نے اس سے ہاتھ ملایا اور پھر سامان کھلوانے اور ترتیب سے لگانے میں اس کی مدد کرنے لگا۔ راشد کو اس بات پر اطمینان ہوا کہ شمشیر باتونی نہیں ہے۔ راشد نے شمشیر کو اپنے بارے میں بتایا لیکن یہ بات چھپا لی کہ وہ متمول گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ شمشیر نے بتایا کہ سیزن ابھی ختم نہیں ہو رہا ہے۔ بہت سے لوگ تو ابھی آنے والے ہیں۔ دونوں بہت جلد گھل مل گئے۔

شمشیر کا پسندیدہ موضوع گھڑسواری اور لڑکیاں تھیں۔ وہ انہی کے بارے میں باتیں کرتا رہتا۔ اس نے ذرا سی دیر میں دسیوں رومانوی قصے سنا ڈالے۔

اگلے روز سے کام شروع ہوا۔ آنے والی لڑکیوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ راشد کی وجہ سے شمشیر کا کام بھی ہلکا ہو گیا۔ توقع کے عین مطابق لڑکیوں نے راشد کو بہت پسند کیا تھا۔

گھڑسواری کے لیے ایک مخصوص روٹ تھا۔ پہلے ہی روز راشد کو اندازہ ہو گیا کہ لڑکیاں بہت آزادہ رو ہیں لیکن وہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ تاہم اس نے کسی لڑکی کو زیادہ آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا۔

تین دن گزر گئے۔ سمیرا اس طرف نہیں آئی۔ دوسری طرف اب ہر لڑکی گھڑسواری کے لیے راشد کی خدمات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ سب کی سب اسے ترغیب دینے والی نگاہوں سے دیکھتیں۔ بعض من چلی لڑکیاں تو فقرے بھی چست کر دیتیں۔

تیسری شام راشد نے سمیرا کے سلسلے میں شمشیر کو کریدا۔

''اوہ۔۔۔۔وہ۔۔۔۔تم اسے جانتے ہو؟'' شمشیر نے پوچھا۔

''نہیں، اپنے ایک دوست سے اس کا تذکرہ سنا تھا۔''

''وہ یہاں کم ہی آتی ہے۔ اس بار آئی تھی لیکن تین چار دن کے لیے اسلام آباد گئی ہوئی ہے۔ دو ایک دن میں واپس آ جائے گی۔ اس کے والدین عام طور پر سفر میں رہتے ہیں۔ ویسے لڑکی بہت خوبصورت ہے۔''

''واقعی؟''

''ہاں، پچھلے دنوں اس کے ساتھ ایک ٹریجڈی ہوئی ہے اس کے ایک بھائی نے، جو کراچی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، اپنے ہاسٹل کے کمرے میں خودکشی کر

لی۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''اسلام آباد اور مری میں قریبی رشتے داری ہے۔ اسلام آباد میں کچھ ہو تو مری والے اس سے بے خبر کبھی نہیں رہتے۔'' شمشیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''خودکشی کی وجہ؟''

''کسی لڑکی کا چکر تھا اور وہ لڑکی اس کے روم میٹ اور عزیز دوست پر فدا تھی۔ دوست بھی کیا' بے رحم آدمی ہوگا۔ دوست کو اپنی جان لیتے دیکھتا رہا' یہ نہیں ہوا کہ اسے بتا دیتا کہ مجھے اس لڑکی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ارے۔۔۔ اس نے تو اسے خودکشی سے باز رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ تماشا دیکھتا رہا۔''

لڑکی کے حوالے پر راشد کو ثمینہ کا خیال آ گیا۔ بات اس کے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ مظفر جانتا تھا کہ اسے ثمینہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس نے خودکشی کی تو ممکن ہے' ثمینہ کی وجہ سے کی ہو۔ کم از کم وہ اس کا سبب ہرگز نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے شمشیر سے پوچھا۔ ''تو تمہارے خیال میں سمیرا کے بھائی کی موت کا ذمے دار اس کا روم میٹ اور دوست تھا؟''

''سو فی صد وہی ذمے دار تھا۔ میں تو اسے قتل کہوں گا۔ یوں کوئی کسی غیر کو بھی اپنے سامنے خودکشی کرتے نہیں دیکھ سکتا' دوست تو دور کی بات ہے۔'' شمشیر نے کہا۔ پھر اچانک بولا۔ ''ایک مشورہ دوں۔ سمیرا سے دور ہی رہنا۔''

''کیوں؟''

''دیکھو۔ وہ بڑے لوگ ہیں' بہت بڑے۔ ان کی زندگی میں مجھ جیسوں اور تم جیسوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔''

''اچھا!''

''ہاں۔ اگر تم بھی دولت مند ہوتے تو اور بات تھی۔ لہٰذا اس سے دور

ہی رہنا۔ ویسے یہاں لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں۔''

''بشرطیکہ تم سے محفوظ رہیں۔''

شمشیر پھول گیا۔ ''ارے نہیں۔ ہم دونوں کی خوب نبھے گی۔ میں نے کچھ نیچے درختوں کے ایک جھنڈ کے درمیان اپنے لیے ایک کیبن بنا لیا ہے تمہیں بھی دکھا دوں گا۔ ضرورت پڑنے پر تم اسے استعمال کر سکتے ہو۔''

''شکریہ دوست!''

راشد سمیرا کو دیکھنے' اس سے ملنے کو بے چین تھا۔ دوسری لڑکیوں کے لیے وہ پسندیدہ ترین موضوعِ گفتگو بن گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہوں نے اس جیسا کوئی لڑکا پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔ وہ سرگوشیوں میں اس کے متعلق باتیں کرتیں' آہیں بھرتیں۔ اسے مغرور قرار دیتیں۔ ایک من چلی نے تو اس کا نام گلیشیر رکھ دیا تھا۔ چند ایک نے تو اسے محبت بھرے خط بھی تھما دیے تھے۔

راشد جانتا تھا کہ ان میں سے بیشتر لڑکیاں صرف رومانس اور ایڈونچر کی خواہشمند ہیں۔ اس نے کبھی کسی لڑکی کو اس وقت تک خراب نہیں سمجھا' جب تک لڑکی نے خود کو خراب ثابت نہیں کر دیا۔ ایسے میں وہ کوئی رعایت بھی نہیں کرتا تھا۔

ٹامی کو بہت زیادہ توجہ مل رہی تھی۔ سب جانتے تھے کہ وہ راشد کا پالتو کتا ہے۔ سب اسے گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے۔ ٹامی اس کا عادی نہیں تھا۔ لیکن اسے وہ سب کچھ بہت اچھا لگتا تھا۔ اب وہ خاصا بڑا اور موٹا تازہ ہو گیا تھا۔ راشد کے ساتھ اسے تین ماہ ہو گئے تھے اور اب وہ بڑا ہو گیا تھا۔ اس نے طرح طرح کے کھیل سیکھ لیے تھے اور اشاروں پر عمل کرتا تھا۔ اس کی تربیت بہت اچھی

ہوئی تھی۔ وہ خوش اطوار تھا اور کبھی کسی کی پریشانی کا باعث نہیں بنتا تھا! البتہ اس کا کھلنڈرا پن پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ پھر رزاق خان کی کتیا سے اس کی پینگیں بڑھنے لگیں۔ وہ اس پر بری طرح فدا تھا۔ مگر دوسری طرف سے اسے لفٹ نہیں مل رہی تھی۔ لڑکیوں کے لیے اس کا ناکام رومانس بھی دلچسپی کا باعث تھا۔ وہ کہتیں کہ راشد کی سنگدلی کی سزا اس کے کتے کو مل رہی ہے۔۔۔بے چارہ! وہ ان سب کو ہی پیارا لگتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اسے راشد تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتی تھیں۔ جس وقت راشد کسی کو گھڑسواری کرا رہا ہوتا' لڑکیاں ہی ٹامی کا خیال رکھتی تھیں۔

راشد تین چار بار شمشیر کے کیبن جا چکا تھا۔ دن میں جب بھی وہ یکجا ہوتے' شمشیر لڑکیوں کے متعلق باتیں کرتا رہتا۔ وہ لڑکیوں کے اصطلاحوں جیسے نام رکھنے میں ماہر تھا۔ کسی کو بوٹی قرار دیتا' کسی کو چھوٹی مرچ اور کسی کو تاڑ کا خطاب دیتا۔ راشد سے کئی لڑکیاں اظہارِ محبت کر چکی تھیں لیکن انہیں راشد کے بے تاثر چہرے پر کبھی کوئی ردعمل نظر نہیں آیا تھا۔۔۔نہ مثبت نہ منفی۔ جیسے وہ جانتا ہو کہ یہ بے ضرر سے رومانوی کھیل کا ایک حصہ ہے۔ البتہ جہاں اسے سنجیدگی محسوس ہوتی' وہ سختی سے ٹوک دیتا۔ کہتا کہ میں تو محبت کے ہجے بھی نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں شمشیر کی پالیسی اور تھی۔ اظہارِ محبت کے جواب میں وہ اور زیادہ شدت سے اظہارِ محبت کرتا۔ وہ ہر لڑکی سے یہی کہتا۔۔۔رُوئے زمین پر تم جیسی حسین کوئی اور لڑکی ہو ہی نہیں سکتی۔

پھر ایک دن سمیرا بھی آ ہی گئی۔ اس وقت تک راشد کے وہاں قیام کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ راشد نے کسی لڑکی کو اس کا نام لیتے سنا تو چونک کر اسے دیکھا۔ ویسے وہ اسے پہچان ہی نہیں پاتا۔۔۔وہ اپنی تصویر سے بہت زیادہ خوبصورت تھی۔ اسے دیکھ کر راشد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ ٹینس کھیلتی ہے۔

راشد نے جلد بازی کرنے کے بجائے تحمل سے کام لیا۔ ایک تو یہ کہ وہ دلچسپی ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ اس طرح راستہ طویل بھی ہو سکتا تھا۔ دوسرے اسے یہ ڈر تھا کہ وہ اسے پہچان نہ لے' ممکن ہے' مظفر کے پاس اس کی کوئی تصویر رہی ہو جو سمیرا نے دیکھی ہو۔ ویسے بھی وہ چاہتا تھا کہ سمیرا اسے اردگرد دیکھنے کی عادی ہو جائے۔ تاکہ یہ مسئلہ حل ہو جائے کہ وہ اسے پہچانتی ہے یا نہیں۔

لیکن دو دن گزر جانے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ سمیرا اسے نہیں پہچانتی۔ وہ اِدھر اُدھر جاتے کن انکھیوں سے اسے دیکھتا۔ وہ بھی زیادہ گھلتی ملتی نہیں تھی۔ تاہم اسے احساس ہو گیا کہ وہ بار بار اور بغور اسے دیکھتی ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں شناسائی کبھی نہیں جھلکی۔ راشد مطمئن ہو گیا۔

ایک شام وہ گھوڑے کو اصطبل کی طرف لے جا رہا تھا کہ کسی نسوانی آواز نے اسے پکارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔۔۔وہ سمیرا تھی۔

''میں سمیرا ملک ہوں۔''

راشد ٹھہر گیا۔ وہ اس کی طرف چلی آئی۔ ''میں گھڑسواری کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ بولی۔

''لیکن اب میری چھٹی ہو گئی ہے۔''

وہ مسکرا دی۔ ''اسے اوور ٹائم سمجھ لو۔''

''ٹھیک ہے۔''

راشد نے اسے گھوڑے پر بیٹھنے میں مدد دی۔ پھر وہ اسے لے کر مخصوص راستے پر چل دیا۔ گھوڑے کی باگیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ وہ تیزی سے کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سمیرا اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ وہ بے دھیانی سے جواب دیتا رہا۔ پھر اس نے گھوڑے کا رخ شمشیر کے کیبن کی طرف کر دیا۔ سمیرا نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ لیکن اس کی نظروں سے چوکنا پن جھلکنے لگا۔

راشد نے کیبن پہنچ کر گھوڑے کو قریبی درخت سے باندھا اور جیب سے چابی نکال کر کیبن کا دروازہ کھول دیا۔ ''اندر نہیں چلوگی؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''کیوں؟''

''میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں؟''

''یہ مت بھولو کہ میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں۔''

''تم بھی ایک بات یاد رکھنا۔ میں ابھی آئی۔'' یہ کہہ کر اس نے گھوڑا کھولا' اچھل کر اس پر سوار ہوئی اور بڑی مہارت سے اونچے نیچے راستوں پر دوڑانے لگی۔ راشد حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے دیکھنے کے باوجود یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی اچھی گھڑسوار ہے۔

کچھ دور جا کر سمیرا نے گھوڑے کو واپس موڑا اور اسی رفتار سے دوڑاتی ہوئی کیبن تک لے آئی۔ پھر اس نے گھوڑے کو درخت سے باندھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ ''اب چلو۔'' چند لمحے بعد اس نے کہا۔

وہ دونوں کیبن میں داخل ہوئے۔ کیبن میں دو کرسیاں تھیں۔ ایک طرف ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ راشد نے سمیرا کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود کونے میں رکھے ہوئے مٹکے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے مٹکے سے پانی نکال کر پیا۔ پھر سمیرا کی طرف بڑھا۔ اس کی طرف سمیرا کی پیٹھ تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا رہا۔ قریب پہنچ کر اس نے بڑی نرمی سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے۔۔۔۔اور پھر اس کے بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

سمیرا اچھل کر کھڑی ہوئی۔ پلٹتے پلٹتے اس کا ہاتھ گھوم چکا تھا۔ راشد نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ وہ چند لمحے اس کی آنکھوں میں

دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں برہمی تھی۔ مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے کیفیت بدل لی۔ اس نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور اس کے کندھے سے سر ٹکا لیا۔

دیر تک وہ اسی طرح کھڑے رہے۔ پھر سمیرا نے اس کے کندھے سے سر اٹھائے بغیر کہا۔ ''تم وقت ضائع نہیں کرتے؟''

''ہاں' مجھے ڈر لگتا ہے' شاید وقت بہت کم ہے۔''

وہ کیبن سے نکلے اور اسی انداز میں واپس ہوئے' جیسے آئے تھے۔ سمیرا اناڑیوں کی طرح گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھی تھی۔ راشد گھوڑے کی باگیں ہاتھ میں لیے پیدل چل رہا تھا۔

شمشیر نے انہیں کیبن سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ تنہائی کا موقع ملتے ہی اس نے راشد سے کہا۔ ''بے وقوف۔۔۔۔میں نے تمہیں منع کیا تھا اس حماقت سے۔''

''تم فکر نہ کرو۔۔۔۔وہ تفریح تھی۔۔۔۔خالص تفریح۔'' راشد نے جواب دیا۔

اگلی صبح راشد معمول کے مطابق جاگنگ کر رہا تھا۔ جاگنگ کے بعد وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ ہر طرف سکوت اور سناٹا تھا۔ ایسے میں اس نے سمیرا کو اپنی طرف آتے دیکھا تو حیران رہ گیا۔

''صبح بخیر۔'' سمیرا نے اس کے قریب آ کر کہا۔

''صبح بخیر' کیسی ہو سمیرا ملک؟''

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے کہا۔ پھر ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں احساس ہے کہ یہاں تمام لڑکیاں تم پر مرتی ہیں۔''

''ہاں، مجھے معلوم ہے۔ ہے نا خوف ناک بات؟''

''تم خود فریبی کا شکار رہو؟ فریب بھی دیتے ہو؟''

''ذرا بھی نہیں۔ دونوں باتیں غلط ہیں۔'' راشد نے کہا۔ ''میرا نام راشد حسن ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' سمیرا نے متانت سے کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا رہا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کی کل کی حرکت غیر مؤثر ثابت نہیں ہوئی۔ وہ شرمندہ بھی ہوئی تھی لیکن اسے اچھا بھی لگا تھا۔ وہ دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ اس سے پہلے سمیرا کو کسی نے اس طرح نہیں چھوا ہوگا۔ اب اس کی بے نیازی سمیرا کے لیے پریشان کن ہوگی۔

''تم یقینی طور پر دھوکے باز آدمی ہو۔'' سمیرا نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ ''اور خود فریبی کے مریض بھی ہو۔''

''کیوں؟ یہ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''کل تم نے میرے ساتھ وہ حرکت کیوں کی؟ تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ وہ مجھے برا لگ سکتا ہے۔''

''لیکن وہ حرکت تمہیں بری نہیں۔۔۔۔اچھی لگی تھی۔''

''میں مانتی ہوں کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن تمہارے پاس اپنے اس اندازے پر یقین کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ بتاؤ۔۔۔۔تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''اس لیے کہ اتنی شدت سے کسی چیز کو میرا دل نہیں چاہا۔'' سمیرا کے رخسار تمتما اٹھے۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرا کوئی گھٹیا مقصد نہیں تھا۔ نہ میں تمہیں تکلیف پہنچانا چاہتا تھا۔''

''میں جانتی ہوں لیکن تکلیف تو مجھے پہنچی نا۔'' یہ کہہ کر سمیرا نے اس کا ہاتھ تھاما اور اپنے رخسار سے لگا لیا۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔'' وہ خواب ناک لہجے

میں بولی۔ ''میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کبھی ایسی بھی ہو سکتی ہوں۔۔۔۔ایسا بھی کر سکتی ہوں۔''

راشد اپنے ردعمل پر خود بھی حیران رہ گیا۔ اس کے پورے جسم میں کیف و انبساط کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔ مسرت آمیز سنسنی جو اس کے لئے ایک نئی چیز تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ ایسے لمس کا ذائقہ اس نے پہلے کبھی نہیں چکھا تھا۔ یہ حقیقت بھی تھی۔ پچھلی تمام قربتیں بھرپور ہونے کے باوجود اس کے لیے بے رنگ و بے کیف رہی تھیں۔

''تم عجیب آدمی ہو۔ لڑکیاں تو کہتی ہیں کہ تم بے حس ہو۔ لیکن مجھے تو تم گوشت پوست کے، محسوسات سے لبریز انسان لگتے ہو۔''

محسوسات۔۔۔۔جذبات! یہ وہ چیزیں تھیں جن سے وہ بچتا۔۔۔۔دامن چھڑاتا آیا تھا۔ مگر اب صورت حال کچھ اور تھی۔ وہ کچھ خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''میں محسوسات سے عاری نہیں ہوں۔'' اور یہ حقیقت تھی، اس وقت وہ خود کو سرد بالکل محسوس نہیں کر رہا تھا۔ جیسا کہ لڑکیوں کی قربت میں ہمیشہ کرتا تھا۔ وہ دیر تک اس کے ہاتھ سے رخسار ٹکائے کھڑی رہی۔ پھر اس نے بڑی نرمی سے اس کا ہاتھ چھوڑا اور بولی۔ ''اب میں چلتی ہوں۔ پھر ملیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ واپس چل دی۔ راشد بھی ہوٹل کی طرف واپس چل دیا۔

سامنے والی پہاڑی کی اوٹ سے سورج کی پہلی پہلی کرن جھانک رہی تھی۔

اس روز راشد دیر تک خود کو سمجھنے کی کوشش میں الجھتا رہا۔ جو کچھ ہوا، وہ اس کے لیے نیا تھا۔ اس لڑکی نے نہ جانے کیا سحر پھونکا تھا کہ برسوں کے نظریات

ریت کی دیوار کی طرح بیٹھ گئے تھے۔ اس نے بچپن سے جو پہلی چیز سیکھی تھی، وہ جذبات سے اور بالخصوص محبت سے ڈرنا تھا۔ محبت اور توجہ اسے کبھی ملی بھی تو نہیں تھی۔

وہ سمیرا کے لمس کا اب بھی تصور کرتا تو جسم میں زندگی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی۔ جسم مرتعش ہو جاتا، جو کبھی نہیں ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تجربے نے اسے ہلا دیا تھا۔ لیکن وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور تھا کہ وہ تجربہ بے حد شاندار، نرم اور حدت آفریں تھا۔ اسے لطف آیا تھا مگر وہ اس بات سے پریشان تھا کہ اس میں کوئی گڑبڑ کر دینے والی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔

صبح دس بجے وہ باہر آیا تو سمیرا سے سامنا ہو گیا۔ وہ شاید اس کی منتظر تھی۔

''ساڑھے سات بجے مجھے لینے میرے گھر آ جانا۔ نیچے وادی میں گھومنے چلیں گے۔'' سمیرا نے کہا اور یوں پلٹ کر چل دی جیسے صرف یہی کہنے آئی تھی۔

اس شام راشد ٹامی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

رزّاق خان نے اسے اپنی گاڑی کی چابیاں دیں اور نیچے جا کر گوشت لانے کی ہدایت کی۔ راشد ایسے موقعوں پر خوش ہوتا تھا۔ اس طرح اس کا ڈرائیونگ کا شوق بھی پورا ہوتا تھا۔ راشد کا ارادہ تھا کہ شمشیر کو بھی ساتھ لے جائے گا۔ لیکن جب اس نے شمشیر کو لڑکیوں میں گھرے دیکھا تو ارادہ ملتوی کر دیا۔ چنانچہ اس نے ٹامی کو عقبی نشست پر بٹھایا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے ہوٹل سے سڑک پر لے آیا۔ اس نے کار کی کھڑکیوں کے شیشے نہیں چڑھائے تھے۔

ٹامی عقبی نشست پر اپنے مخصوص انداز میں بیٹھا تھا۔ پچھلے پاؤں سیٹ پر اور دونوں اگلے پنجے اور تھوتھنی کھلی ہوئی کھڑکی پر رکھی تھی۔۔۔۔ کار میں سیر کرنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کی خوشی دیدنی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ کھڑکی سے سر باہر بھی نکال لیتا تھا۔ راشد نے گاڑی سڑک پر موڑی۔ دوسری

طرف سے ایک کار آ رہی تھی۔ اسی وقت رزاق خان کی کتیا نے بھونکنا شروع کر دیا۔ ٹامی ویسے ہی اس پر فدا تھا۔۔۔۔ اور کتیا نے پہلی بار اسے پکارا تھا۔ وہ بے تابانہ کھڑکی پر چڑھا اور باہر چھلانگ لگا دی۔ اس وقت تک دوسری طرف سے آنے والی کار بہت قریب آ چکی تھی۔ کار کے ڈرائیور نے بریک لگانے کی بھرپور کوشش کی۔

راشد نے تیزی سے گاڑی روکی اور دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ دوسری کار کا ڈرائیور بھی نیچے اتر چکا تھا اور بے بسی سے اپنی کار کے نیچے دیکھ رہا تھا۔ راشد اس طرف جھپٹا۔ اس نے دوسری کار کے ڈرائیور کو بالکل نظرانداز کر دیا۔

ٹامی وھیل کے پیچھے پڑا تھا۔ وہ بری طرح زخمی ہوا تھا۔ وہ گھسٹ کر اپنی محبوب کتیا کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر خود کو گھسیٹنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ راشد نے ہاتھ بڑھا کر اسے باہر کھینچ لیا۔ کچھ لوگ کار کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ڈرائیور صفائی پیش کر رہا تھا۔ ٹامی کی نگاہوں میں دہشت تھی۔ اس کی پچھلی ٹانگیں محض دھاگے جیسی کھال کی وجہ سے دھڑ سے جڑی ہوئی تھیں۔ ورنہ ان کے الگ ہو جانے میں کوئی کسر نہیں رہی تھی۔ وہ خون میں نہایا ہوا تھا۔

راشد نے جان لیا کہ اب وہ بچ نہیں سکتا۔ جلد از جلد موت ہی اس کے لیے بہتر ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ اسے ختم کیسے کرے۔ وہ جتنی دیر زندہ رہتا، اتنی ہی اذیت اٹھاتا۔ راشد نے اپنی جیب ٹٹولی مگر اس میں چاقو موجود نہیں تھا۔ بالآخر اس نے سختی سے کتے کے گلے پر ہاتھ جما دیا لیکن موٹی کھال کی وجہ سے پورا دباؤ نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بھرپور دباؤ ڈالا۔ اسے اپنی انگلیوں کے درمیان ربر کی طرح نرم اور لچک دار نرخرہ پھڑ پھڑاتا محسوس ہوا۔ کتا زبان باہر نکال کر سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی تھوتھنی دوسری طرف تھی

لیکن وہ کبھی کبھی سر گھما کر راشد کو دیکھتا۔ اس کی نگاہوں میں خوف بھی تھا' التجا بھی اور تحمل و برداشت بھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا لیکن جیسے اسے راشد پر اب بھی اعتبار تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے' اس کی بہتری ہی کے لیے کر رہا ہے۔

راشد کے ہاتھوں کا۔۔۔ انگلیوں کا دباؤ بڑھتا رہا۔ زور لگانے سے اس کے ہاتھ اور کندھے تک لرزنے لگے۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ کتے کی گردن اتنی سخت ثابت ہوگی۔ راشد کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ کر بہہ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے آنکھیں بند کرنا پڑیں۔

شمشیر بھی وہاں آ گیا تھا۔ اس نے راشد کو روکنے کی کوشش کی۔ لیکن راشد بدستور دباؤ بڑھاتا۔۔۔ اور لرزتا رہا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے کندھے تھپک رہا ہے۔۔۔ اور کتا بھی بے جان ہو گیا ہے۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور پلٹ کر دیکھا۔ شمشیر اس کے کندھے تھپتھپا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ راشد نے ٹامی کو دیکھا۔ وہ مر چکا تھا۔

راشد وہیں سڑک پر بیٹھا رہا۔ اس نے کتے کی گردن سے انگلیاں ہٹا لیں۔ اس کی انگلیاں خون سے لتھڑی ہوئی تھیں۔۔۔ اور بہت زیادہ زور لگانے کی وجہ سے ان میں اینٹھن پیدا ہو گئی تھی۔ وہ دکھ رہی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھ بغلوں میں دبا لیے۔ اس نے زندگی میں کبھی اتنا زور نہیں لگایا تھا۔ تھکن کا احساس اس کے رگ و پے میں اتر گیا تھا۔ پھر وہ اٹھا۔۔۔ اور اس نے جھک کر ٹامی کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا اور اسے اپنی گاڑی کی طرف لے آیا۔ گاڑی کی عقبی نشست پر ایک بڑا شاپنگ بیگ رکھا تھا۔ اس نے کتے کو بیگ میں ٹھونس دیا۔ پھر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آیا اور اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

وہ نیچے بازار گیا اس نے مطلوبہ سامان خریدا۔ اس دوران اس نے کسی کو حادثے کے بارے میں نہیں بتایا۔ سامان کی خریداری کے دوران وہ خوش دلی

سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے بک اسٹال سے ایک ڈائجسٹ بھی خریدا۔ اس کا انداز ہر روز جیسا تھا۔

سامان خرید کر وہ واپس آیا۔ اس نے سامان رزاق خان کو دیا اب اسے ٹامی کی تدفین کرنا تھی۔

ٹامی کو دفن کر کے آتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے شمشیر کے الجھے ہوئے سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ خود اپنی سوچوں کا بھی تجزیہ کر رہا تھا۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے نزدیک ٹامی کی کتنی اہمیت تھی۔ اسے احساس تھا کہ جو کچھ اس نے آج کیا تھا' ایسے منظر لوگ کبھی کبھار ہی دیکھتے ہیں۔ اور جب وہ دیکھتے ہیں تو ان کا جذباتی ردِعمل بھی ہوتا ہے' خواہ ان کی حیثیت ایک عام تماشائی کی ہو اور راشد کو ایسے جذباتی ردِعمل سے اور ایسے جذباتی لوگوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اس کے نزدیک یہ جذباتی فضول خرچی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ لوگ خود کو اپنے جذبات سے علیحدہ رکھنا سیکھ لیں۔ کیوں کہ جذبات کے چکر میں وہ اپنا قیمتی وقت بھی ضائع کرتے ہیں اور توانائی بھی۔

وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ شمشیر آ گیا۔ اس وقت راشد منہ دھونے کے بعد آئینے کے سامنے کھڑا بے دھیانی میں سیٹی بجا رہا تھا۔ شمشیر آتے ہی اس کے بستر پر گر گیا۔

''مجھے افسوس ہے راشد!'' اس نے کہا۔

''کیسا افسوس؟'' راشد کا سیٹی بجانا موقوف ہو گیا۔

''ٹامی کے بارے میں۔ بہت اچھا کتا تھا وہ۔''

"وہ افسوس ہے کہ مجھے اس کو اس طرح ختم کرنا پڑا۔ کاش' اس وقت میری جیب میں چاقو ہوتا!"

"واقعی۔۔۔۔ بہت تکلیف دہ کام تھا۔" شمشیر خان نے کہا۔ "نامی جس شخص کی گاڑی کے نیچے آیا' وہ بے چارہ دیر تک مجھ سے بات کرتا رہا۔۔۔ افسوس کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ نامی ایک دم ہی گاڑی کے سامنے آگیا تھا۔ اور وہ کوشش کے باوجود بروقت گاڑی نہ روک سکا۔ وہ بہت افسردہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا نام اور پتا بھی دیا۔" شمشیر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"تمہیں چاہیے اس کا نام پتا؟"

"نہیں۔"

"تو تم اس سے نہیں ملو گے؟"

"نہیں۔"

"وہ بے چارہ بہت شرمندہ تھا۔"

"خواہ مخواہ۔۔۔۔ جبکہ اس کی کوئی غلطی بھی نہیں تھی۔" راشد نے کہا۔ "اب میں اس سے ملوں گا تو وہ اور شرمندہ ہوگا۔"

"تمہاری مرضی' اب کیا پروگرام ہے؟"

"کسی کے ساتھ سیر کو جانے کا ارادہ ہے۔ ہوسکتا ہے' کیبن کی طرف بھی جاؤں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب یہ بتاؤ کس کے ساتھ جا رہے ہو؟"

"سمیرا ملک کے ساتھ۔"

"حماقت۔۔۔۔ بے وقوفی۔"

"وہ کیوں؟"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ وہ کھیل کے لیے موزوں نہیں ہے۔ وہ بڑے گھر

کی لڑکی ہے۔ اس کے لیے تو بڑا آدمی چاہیے۔"

"میں مستقبل کا بڑا آدمی ہوں۔" راشد نے سینہ پھلا کر کہا۔

"ایک بات سنو راشد' تمہیں اپنے کتے کو اپنے ہاتھوں ہلاک کرنا پڑا۔ یہ ضروری تھا۔"

"ہاں۔۔۔۔ ضروری تو تھا۔"

"میں تمہاری جگہ ہوتا تو یہ سب کچھ نہ کرسکتا۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"میرا مطلب ہے' اتنی ہمت کم ہی لوگ کرسکتے ہیں۔"

"میں یہ بھی جانتا ہوں۔ اب اس قصے کو چھوڑو۔ وہ مردود کتا تو مر چکا تھا۔۔۔"

شمشیر حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔۔۔

اختر ملک کے بنگلے کا دروازہ ایک پہاڑی عورت نے کھولا۔ راشد نے اسے بتایا کہ وہ سمیرا سے ملنا چاہتا ہے۔ "آپ اندر آجایئے۔" ملازمہ نے کہا۔ وہ راشد کو ڈرائنگ روم میں لے گئی اور اسے بٹھا کر خود اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد سمیرا آئی۔ عنابی رنگ کے سوٹ میں بے حد حسین لگ رہی تھی۔ راشد اسے دیکھتا رہ گیا۔

"ہیلو۔۔۔۔ یہ اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟" سمیرا نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

"میرے ساتھ جانے پر تمہارے والدین کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

اس نے سمیرا کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''ذرا بھی نہیں۔ وہ اپنی اولاد کو آزادی دینے کے قائل ہیں اور میں اس آزادی سے کبھی کوئی غلط فائدہ نہیں اٹھاتی۔'' یہ کہتے کہتے سمیرا کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ شاید اسے مظفر کا خیال آ گیا تھا' جس نے آزادی کا بدترین استعمال کیا تھا۔

''تو چلو۔''

وہ گھر سے نکل آئے۔ جناح روڈ کے ایک ریستوران میں انہوں نے کافی پی۔ وہاں سے وہ اٹھے تو سمیرا نے پوچھا۔ ''اب؟''

''اسی کیبن میں چلیں گے۔'' راشد نے کہا۔

سمیرا نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا لیکن انکار کیا نہ اعتراض۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل دی۔ کیبن میں پہنچ کر وہ پلنگ پر بیٹھ گئے۔ راشد نے سمیرا کا ہاتھ تھام لیا۔ اس لمحے راشد کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ معصومیت کے لمس سے اب تک ناآشنا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ لمس اس قدر معصوم بھی ہو سکتا ہے۔ وہ لمس اسے یہ بھی بتا رہا تھا کہ وہ اس وقت کچھ بھی کر لے' سمیرا مدافعت نہیں کرے گی۔ مگر وہ خود کو ایک عجیب سے بندھن میں بندھا محسوس کر رہا تھا۔ وہ سمیرا کے بارے میں مختلف انداز میں سوچ رہا تھا۔ وہ تو ایک بے حد حسین' بہت ہی نازک تعلق تھا۔ جو اُن دونوں کے درمیان چپکے سے استوار ہو گیا تھا۔ اس انداز میں اس نے پہلے کبھی نہیں سوچا' کبھی نہیں محسوس کیا تھا۔ وہ سمیرا کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔ اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے نزدیک اس بات کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اور اسے یقین تھا کہ وہ پاکیزہ اور اچھوتی ہے۔۔۔۔ بہار کی پہلی کلی کی طرح۔ اگر وہ اسے توڑ لیتا تو بھی وہ اعتراض نہ کرتی۔ مگر وہ خود مایوس ہوئے بغیر نہ رہتی۔ اپنے آپ پر اسے جو مان تھا' وہ ٹوٹ جاتا۔ اور وہ

ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ اس کا ہاتھ تھامے یہ سب کچھ سوچتا رہا۔ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ وہ اسے بغور دیکھ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''سمیرا چلو گھر چلیں۔''

وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی۔ وہ نظریں بول رہی تھیں۔۔۔ بتا رہی تھیں کہ وہ اس کے تمام محسوسات کو پوری طرح سمجھ رہی ہے۔ پھر اس نے راشد کا ہاتھ اپنے رخسار سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''شکریہ راشد۔ تم بہت اچھے ہو۔''

وہ باہر نکل آئے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اوپر جانے والے راستے پر قدم بڑھاتے رہے۔

''کیا تم ساری لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہو۔۔۔؟'' سمیرا نے پوچھا۔

راشد نے شاکی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا۔''

''مجھے یقین ہے تمہاری بات پر۔ سب لڑکیاں یہی کہتی ہیں کہ تم بہت سرد مہر ہو۔''

''اچھا! لڑکیاں میرے متعلق بات کرتی ہیں؟''

''تم ان کا پسندیدہ ترین موضوعِ گفتگو ہو۔''

''لڑکیوں میں یہ بڑی خرابی ہوتی ہے۔''

''سنو راشد۔۔۔۔۔ میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔''

''تو تم اس بیان کے ذریعے لڑکیوں میں میری ساکھ بحال کر دو گی؟''

''ہاں۔ میں کہوں گی' راشد تو بہت پیارا۔۔۔ بہت ہی اچھا ہے۔ دل بھی اچھا ہے اور۔۔۔۔''

''اور پیار کرنا بھی جانتا ہے۔'' راشد نے شریر لہجے میں جملہ پورا کیا۔

''ہاں۔ یہ بھی کہوں گی۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوگا۔''

''لیکن پھر لڑکیاں مجھے بھی عجیب قرار دینے لگیں گی۔'' سمیرا نے فکرمندی سے کہا۔ ''کہیں گی' دونوں ایک جیسے ہوں گے۔ تبھی تو یہ اس کے گن گا رہی ہے۔ نہیں بھئی۔۔۔ بہتر یہی ہے کہ میں کچھ نہ کہوں۔ بس گردن اکڑائے' سر اونچا کیے پھرتی رہوں۔ اس انداز سے سب سمجھ لیں گی کہ کائنات میرے قدموں میں جھک آئی ہے۔''

''ہاں۔۔۔ یہ بہتر رہے گا۔''

سمیرا نے چلتے چلتے سر اس کے کندھے سے ٹکا دیا۔

''راشد۔۔۔ تم مجھے واقعی بہت اچھے لگتے ہو۔'' اس نے خوابناک لہجے میں کہا۔

''شکریہ۔'' راشد نے کہا۔ پھر بولا۔ ''سمیرا۔۔۔ تم عام طور پر گرمیوں کی چھٹیوں میں یہاں نہیں آتیں۔ اس سال کیوں آئیں؟'' پھر اس نے سمیرا کو چونکتے دیکھا تو تیزی سے بات بنائی۔ ''مجھ سے ملنے؟'' اس کے لہجے میں شوخی تھی۔ لیکن سمیرا بدستور سنجیدہ رہی۔ اس نے راشد کے کندھے سے سر اٹھا لیا۔

''شمشیر نے بتایا تھا کہ تم یہاں کم ہی آتی ہو۔'' راشد نے وضاحت کی۔

''کچھ عرصہ پہلے میرے بھائی کا انتقال ہوگیا۔'' سمیرا نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''میں یہ سوچ کر آ گئی کہ ممکن ہے' میری موجودگی میں ممی اور پاپا بہل جائیں۔'' پھر وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولی۔ ''لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ دونوں پینے لگے ہیں۔ پاپا نشے میں ہوتے ہیں تو غمگین ہو جاتے ہیں اور ممی نشے میں رونے لگتی ہیں۔''

''اور جب دونوں نشے میں نہیں ہوتے تو کیا کرتے ہیں؟''

''پیتے ہیں۔'' سمیرا نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''اور ان کا یہ حال بیٹے کی موت کی وجہ سے ہوا ہے؟''

''نہیں' پیتے تو وہ پہلے بھی تھے۔ ہماری سوسائٹی میں سبھی پیتے ہیں۔ بشرطیکہ میسر آ جائے۔ فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ پہلے ڈیڈی نشے میں ہوتے تو انہیں یقین ہو جاتا تھا کہ ان کا ہر نقطۂ نظر درست ہے۔ جب کہ ممی کو نشے میں یہ یقین ہو جاتا تھا کہ پاپا غلطی پر ہیں۔ اب ممی روتی ہیں اور پاپا چپ بیٹھے رہتے ہیں۔''

''بس۔۔۔ خود پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں۔''

''میں خود ترسی کا شکار ہرگز نہیں ہوں۔ میرے بھائی نے خودکشی کی تھی۔''

سمیرا کے ہاتھ پر راشد کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ جیسے وہ اسے سہارا دینا چاہ رہا ہو۔ ''وہ مجھ سے ایک سال بڑا تھا۔'' سمیرا کہتی رہی۔ ''صرف انیس سال کا تھا وہ۔ بہت ذہین' بہت خوش شکل تھا۔ تعلیمی ریکارڈ بھی بہت اچھا تھا۔ اس کا۔''

''مگر اس نے خودکشی کیوں کی؟'' راشد نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

''وہ اعصابی طور پر کمزور تھا۔ ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ وہ لڑکی اس کے عزیز ترین دوست اور روم میٹ کو پسند کرتی تھی۔ میرے بھائی نے اپنے روم میٹ کی موجودگی میں خودکشی کی اور وہ خبیث تماشا دیکھتا رہا۔ اس نے مظفر کو روکنے' اسے سمجھانے کی برائے نام بھی کوشش نہیں کی۔''

''تو کیا نشے میں تھے دونوں؟'' راشد کو اپنے سوال پر خود بھی حیرت ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی تیسرے فرد کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے۔ جیسے وہ جو کچھ سن رہا ہے' وہ اس کے اپنے نہیں' کسی اور کے متعلق ہو۔۔۔ اور پہلی بار سن رہا ہو۔

"نہیں، وہ نشے میں نہیں تھے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مظفر نے ایسا کیوں کیا؟"

"مجھے تو نہیں معلوم۔ کاش۔۔۔۔ میں تمہیں بتا سکتا۔"

"مجھے مظفر نے اپنے روم میٹ کے بارے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ بہت ہینڈسم لڑکا ہے اور اس کا باپ وکیل ہے۔ اس سے زیادہ اس نے کبھی نہیں بتایا۔"

راشد سوچتا رہا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال سر اٹھا رہا تھا۔ مگر اس کے خدوخال ابھی واضح نہیں تھے۔

ٹامی کا گلا گھونٹنا راشد کے لیے ذرا بھی تکلیف دہ نہیں رہا تھا۔ لیکن اگلے دن ہوٹل میں لوگ اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ وہ بہت افسردہ تھے کہ ٹامی کے مقدر میں ایسی موت آئی۔ راشد کا رِدِّعمل کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سب سے یوں علیک سلیک کی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ معمول کے مطابق ہنس رہا تھا۔۔۔ بول رہا تھا۔۔۔ مسکرا رہا تھا۔ وہ ذرا بھی افسردہ نہیں لگ رہا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بے پناہ ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ لیکن راشد کی آنکھوں میں دیکھ کر انہیں بھی مایوسی ہوئی۔ انسان کتنا ہی گہرا ہو، آنکھوں میں اس کے باطن کا ہلکا سا رنگ ضرور ابھر آتا ہے۔ راشد کی آنکھوں میں کوئی رنگ نہیں تھا۔

لوگوں کے نزدیک یہ بات بہت عجیب تھی۔ وہ کتے سے بہت محبت کرتا تھا۔۔۔ اس کا خیال رکھتا تھا۔ اس نے ٹامی کی تربیت پر یقیناً بہت زیادہ محنت کی

ہوگی۔ تو کیا اسے ٹامی سے محبت نہیں تھی۔ اس کے رِدِّعمل سے تو یہی ثابت ہوتا تھا۔ راشد کو اپنی طرف دیکھنے والی نگاہوں میں جو الجھن نظر آئی وہ اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ یہ چیز وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ لوگ اس سے جذباتی رِدِّعمل کی توقع رکھتے تھے۔۔۔۔ اور وہ بھی ایک کتے کی موت پر، تو یہ ان کی حماقت تھی۔ یہ ان کی کمزوری تھی، اس کی نہیں۔ شام تک سب کو یقین ہو گیا کہ راشد پر کوئی اثر نہیں ہوا۔۔۔ اور کوئی اثر نہیں ہوگا۔ چنانچہ نگاہوں کی الجھن دور ہو گئی۔

اس روز راشد نے بینک سے رقم نکلوائی اور راولپنڈی سے ایک موٹر سائیکل خرید لایا۔ شام کے وقت وہ ٹرائی کر رہا تھا۔ ہوٹل کے سامنے والی سڑک پر دو تین بڑے خطرناک موڑ تھے۔ وہ وہاں سے پوری رفتار سے موٹر سائیکل کو گزارتا اور اچانک بریک لگاتا۔ کئی بار تو موٹر سائیکل سڑک سے ہٹ کر کچے میں چلی گئی۔ ایک انچ اور باہر ہوتی تو سینکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں جا گرتی۔

راشد کے نزدیک موٹر سائیکل چلانا بھی ایک کھیل تھا اور وہ ہر کھیل پرفیکشن کے ساتھ کھیلنے کا قائل تھا۔ اس کا اصول تھا کہ اگر ٹھیک طرح سے کھیلا نہ جائے تو آدمی کھیل کو خیرباد ہی کہہ دے۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے موڑ کاٹتے ہوئے کن انکھیوں سے دیکھا۔ سڑک کے کنارے سمیرا کھڑی اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ راشد نے کچھ دُور جا کر بریک لگائے۔ سمیرا تیز تیز قدم اٹھاتی اس کے پاس آئی۔ راشد موٹر سائیکل ہی پر بیٹھا رہا۔

"راشد حسن!" اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "آئندہ کبھی ایسا نہ کرنا۔"

راشد نے موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کی اور اس کے سامنے آ گیا۔

''کیسا نہ کروں؟'' اس نے پوچھا۔

''آئندہ اس طرح موٹر سائیکل کبھی نہ چلانا۔ تم نے مجھے مرجانے کی حد تک خوف زدہ کر دیا تھا۔ آئندہ کبھی۔۔۔۔ کبھی ایسا نہ کرنا۔۔۔۔ کبھی نہیں۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو؟''

سمیرا نے جواب میں جو کچھ کیا' وہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس نے پوری قوت سے اس کے رخسار پر طمانچہ رسید کر دیا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ راشد لڑکھڑا گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

''آئندہ کبھی ایسا نہ کرنا۔ سمجھے؟'' وہ غرائی۔ اس لمحے وہ بپھری ہوئی شیرنی لگ رہی تھی۔ پھر وہ پاؤں پٹختے ہوئے' ہوٹل کی طرف چل دی۔ راشد سناٹے کی سی کیفیت میں کھڑا رہا۔ زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کسی نے اسے مارا ہو۔۔۔۔ بالخصوص صنفِ نازک نے۔ اور کمال یہ تھا کہ سمیرا کی یہ حرکت اسے بری نہیں لگی تھی لیکن اس کی سمجھ میں سمیرا کا اس طرح بپھرنا نہیں آ رہا تھا۔

اس نے سمیرا کو پکارا۔ مگر سمیرا نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگا۔ دروازے پر ہی وہ اس تک پہنچ سکا۔ وہ اپنی کار کی طرف بڑھتی رہی۔

''میری بات تو سنو'' اس نے کہا۔ وہ دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

راشد بونٹ پر کہنی ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ ''تم نے تھپڑ کیوں مارا؟'' اس نے پوچھا۔

''بچوں کی سی حماقت کرو گے تو تھپڑ ہی کھاؤ گے۔ دکھاوا اور بے پروائی بہت بڑی حماقت ہوتی ہے۔ تم زخمی بھی ہو سکتے تھے۔ تمہیں کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔''

''لیکن مجھے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا۔''

''بس۔۔۔۔ ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔'' وہ غصے سے بولی۔

''کیا تم میری ذمے دار ہو۔ میری ذمے داری اپنے سر لے رہی ہو؟'' یہ سوال خود بخود راشد کے منہ سے نکلا۔

''ہاں' بالکل لے رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر سمیرا نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ راشد بڑی مشکل سے ہٹ پایا۔

وہ چند لمحے سر کھجاتا اور جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھتا رہا۔ اس کے ساتھ اتنا عجیب رویہ کبھی کسی کا نہیں رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔۔۔۔ لیکن اسے موٹر سائیکل چلاتے دیکھ کر سمیرا خوف زدہ ہوئی تھی اور پھر غصے میں آپے سے باہر ہو گئی تھی۔ سوال یہ تھا کہ اس کے زخمی ہو جانے سے سمیرا کو کیا فرق پڑ سکتا تھا۔

سمیرا نے اس کے موٹر سائیکل چلانے کو دکھاوا کہا تھا۔۔۔۔ شو بازی سمجھا تھا۔ جب کہ وہ دکھاوے کا آدمی ہی نہیں تھا۔ اسے کبھی پروا نہیں ہوتی تھی کہ کون اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔۔۔۔ کیا سمجھ رہا ہے۔ وہ تو ہر کھیل پورے ڈھنگ سے' دیانت داری سے کھیلنے کا قائل تھا۔ اس کے خیال میں اگر کوئی شخص پرفیکشن کے ساتھ موٹر سائیکل چلانے کا اہل نہیں تو اسے موٹر سائیکل چلانا ہی نہیں چاہیے۔ اور اگر وہ چلائے تو اسی قابل ہے کہ کسی کھڈ میں گر کر مر جائے۔۔۔۔ کسی حادثے سے دوچار ہو جائے۔

یہ سب سوچتے سوچتے راشد کو غصہ آ گیا۔ اس سے کبھی کسی نے اس طرح بات نہیں کی تھی۔ پھر اس نے ذہن سے غصہ جھٹکا اور سمیرا کے ردِعمل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ سمیرا نے یہ کیوں سوچا کہ وہ اس کی ذمے داری ہے۔ اس کے تحفظ کی سمیرا کو کیوں فکر لاحق ہوئی۔ اچانک وہ ٹھٹک گیا۔ ڈر گیا۔ بات سادہ سی تھی۔ سمیرا کو اس سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اسے معمولی سی تکلیف میں بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسے خطرناک انداز میں موٹر سائیکل چلاتے دیکھ کر

خوف زدہ ہوگئی تھی۔۔۔۔مرجانے کی حد تک! ہاں۔۔۔۔یہی تو کہا تھا اس نے اور یہ ردِعمل صرف اس لیے تھا کہ اسے اس کی پرواتھی۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔

وہ خود بخود مسکرادیا۔زندگی میں پہلی بار کسی نے اس کی پروا۔۔۔۔اس کی فکر کی تھی۔ بچپن میں وہ بارش میں ننگے بدن باہر نکل جاتا تو کوئی اسے نہ ٹوکتا۔۔۔۔نہ ممی' نہ ڈیڈی۔ دوسرے بچوں کو ٹوکا جاتا۔ ان کی مائیں دانت پیس پیس کر کہتیں۔ مردود۔۔۔۔اس بارش میں بھیگے گا تو نمونیا ہو جائے گا۔۔۔۔اور بھگتیں گے ہم' لیکن لفظوں کے برعکس لہجہ بتاتا کہ انہیں بھگتنے کی نہیں' اپنی بچے کی جان کی فکر ہے۔لیکن ممی کبھی اس کے لیے پریشان نہیں ہوئی تھیں۔ انہوں نے کبھی اسے اپنا خیال رکھنے کی ہدایت نہیں کی تھی۔شاید اسی لیے وہ خود کو خطرات میں ڈالنے کا عادی ہوگیا تھا کہ کبھی ممی اسے ٹوک دیں۔ مگر ممی نے کبھی نہیں ٹوکا۔ بڑے ہوتے ہوتے یہ خواہش لاشعور میں چلی گئی اور شعور اسے پرفیکشن کے حصول کی خواہش قرار دے بیٹھا۔ عادت فطرت بن گئی۔

وہ آپ ہی آپ ہنس دیا۔اس کی محبت میں سمیرا نے اس کی ذمے داری کو اپنا حق سمجھ لیا تھا۔

وہ چائے پینے کی غرض سے ہوٹل میں چلا گیا۔ وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ ایک خاتون نے اسے پکارا۔ وہ پلٹا اور اس کی میز کی طرف چل دیا۔ خاتون بڑے خوب صورت انداز میں مسکرا رہی تھی۔وہ نیا چہرہ تھا۔ خاتون کی آنکھوں میں سرخی اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے۔عمر چالیس کے قریب رہی ہو گی۔ مگر دیکھنے میں وہ پچاس سے زیادہ کی لگتی تھی۔اس کے ساتھ جو مرد بیٹھا تھا' اسکی آنکھیں بھی ایسی ہی تھیں۔

''تم راشد حسن ہو نا؟'' خاتون نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''میں سمیرا کی ممی ہوں۔۔۔۔اور یہ اس کے پاپا۔'' خاتون نے کہا۔

پھر پوچھا ''چائے پیو گے؟''

''جی نہیں' شکریہ۔''

''پھر بھی کچھ دیر بیٹھو میرے پاس۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

راشد خاموشی سے بیٹھ گیا۔

''سمیرا تمہیں بہت پسند کرنے لگی ہے۔ اس سے پہلے اس نے کبھی کسی کا تذکرہ اتنے زور وشور سے نہیں کیا تھا۔سنا ہے کل تمہارا پالتو کتا مر گیا؟''

''جی ہاں۔''

''مجھے افسوس ہوا یہ سن کر۔ کتے مجھے بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔''

راشد خاموش رہا۔ خاتون اسے اچھی نہیں لگی تھی۔اسے لگ رہا تھا کہ وہ اسے ذلیل کرنے کی کوشش ضرور کریں گی۔

''سمیرا کہہ رہی تھی' تم بہت ذہین ہو۔''

''جی ہاں' ذہین تو میں ہوں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ویسے تم پر تو بہت لڑکیاں مرتی ہوں گی۔''

''ممکن ہے' مرتی ہوں۔ میں بہر حال زندہ رہتا ہوں۔''

سمیرا کے باپ نے چونک کر اسے دیکھا۔۔۔۔اور دیر تک بغور دیکھتا رہا۔

''راشد حسن۔۔۔۔تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟''

''وکیل ہیں۔''

''کیا نام ہے ان کا؟''

راشد نے دانستہ ملک کے نامور ترین وکیل کا نام بتایا۔ وہ انہیں یہ تاثر

دینا چاہتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ اس میں کامیاب بھی ہوا۔ اختر ملک نے اسے بڑی بے یقینی سے دیکھا۔ جب کہ خاتون کی نگاہوں سے تمسخر جھلکنے لگا۔ تاہم انہوں نے اسے کھل کر جھوٹا قرار نہیں دیا۔

''اور تم مستقبل میں کیا بننا چاہتے ہو؟''

''میں آرکیٹیکٹ بننا چاہتا ہوں۔'' راشد نے مضحکہ اڑانے والے لہجے میں کہا۔ لیکن اس پر کوئی رَدِعمل سامنے نہیں آیا۔

''خیر راشد۔۔۔۔ میں تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ سمیرا کا خیال دل سے نکال دو۔'' اچانک ہی خاتون کا لہجہ سخت ہوگیا۔

''آپ کو یہ خیال کیوں آیا کہ میرے دل میں سمیرا کا خیال ہے۔'' راشد نے سادگی سے پوچھا۔

''سمیرا کو تم سے ملے دو دن ہوئے ہیں اور وہ ہم سے ہر وقت تمہاری باتیں کرتی رہتی ہے۔ مجھے ڈر ہے' یہ سلسلہ مزید دو ایک دن جاری رہا تو بات آگے بڑھ جائے گی۔''

''میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن اس کے دل میں کیا ہے' اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔'' راشد نے کہا اور اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف چلا آیا۔

اس شام وہ پھر ملے۔ سمیرا نے سب سے پہلے اس سے تھپڑ کے سلسلے میں معذرت کی۔ راشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ابھی بائیں ہاتھ کا تھپڑ باقی ہے۔''

''نہیں۔۔۔۔ میں وعدہ کرتی ہوں' آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گی۔ مجھے معاف کردو۔۔۔۔ پلیز!''

''معاف کرنے کی کوئی بات نہیں۔ تم جب چاہو' یہ حرکت دہرا سکتی ہو۔''

سمیرا کچھ دیر سوچتی رہی' پھر بولی۔ ''راشد۔۔۔۔ تم مجھ سے محبت

کرتے ہو نا؟''

''ہاں' میں زندگی بھر محبت سے بچتا رہا۔ لیکن اب اعتراف کرنے پر مجبور ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

''مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟''

''ٹھہرو۔۔۔۔ مجھے سوچنے دو۔ میں نے اس انداز میں کبھی نہیں سوچا تھا۔'' راشد نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں ابھر آئیں۔ سمیرا اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

''ہاں۔۔۔۔ میں نے پہلے کبھی اتنی شدت سے کوئی خواہش نہیں کی۔''

''میں نے بھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے کم وقت میں کوئی کسی کے اتنا قریب بھی آسکتا ہے۔''

''میں بھی یہی سوچتا ہوں۔''

''مجھ سے شادی کرو گے؟''

''ہاں' ضرور کروں گا۔''

''کب؟''

''جب تم کہو۔''

''آج اور ابھی۔ میں اسی وقت تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

راشد بری طرح چونکا۔ ''اتنی جلدی کیوں؟ اور تمہارے والدین۔۔۔۔؟''

''میں ان سے بات کرچکی ہوں۔ وہ اس پر رضامند نہیں ہیں۔''

''انہیں مجھ میں کیا برائی نظر آئی؟''

''برائی تو کوئی نہیں۔'' سمیرا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''ممی کہتی ہیں۔۔۔۔ تم اتنے خوبرو ہو کہ صرف میرے ہو کر کبھی نہیں رہ سکو گے۔ تمہاری

زندگی میں لڑکیاں آتی جاتی رہیں گی۔''

''جب کہ تم جانتی ہو کہ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔''

''ہاں میں جانتی ہوں۔ لیکن انہیں سمجھا نہیں سکتی۔ بس تم مجھ سے شادی کر لو۔ میں ممی اور پاپا کی دی ہوئی آزادی کا غلط استعمال نہیں کر رہی ہوں۔''

''لیکن تم نے یہ نہیں سوچا کہ فی الحال میرا کوئی مستقبل نہیں۔ میری تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی۔ میں برسرِ روزگار بھی نہیں ہوں۔''

''مجھے کوئی پروا نہیں۔ تم اپنی تعلیم مکمل کر سکتے ہو۔ میرے اکاؤنٹ میں خاصی رقم موجود ہے۔''

''لیکن میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گا کہ۔۔۔''

''فضول باتیں مت کرو۔'' سمیرا نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ ''محبت میں ''میں'' اور ''تو'' کا فرق مٹ جاتا ہے۔ میں وہ کروں گی جو تم چاہو گے اور تمہیں وہ کرنا ہوگا، جو میں چاہتی ہوں۔''

راشد سوچتا رہا۔ شادی کے متعلق اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ کہاں یہ کہ اتنا بڑا فیصلہ اتنی سرعت سے کرنا۔ ان چند لمحوں میں اس نے خود کو بہت اچھی طرح ٹٹولا لیکن جواب بہت واضح تھا۔ اسے سمیرا سے محبت تھی۔۔۔ اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اسے سمیرا پر انحصار کرنا بھی برا نہیں لگ رہا تھا۔ یہ بہت بڑا انقلاب تھا۔ ورنہ وہ تو والدین کا سہارا لینا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

فوری طور پر شادی کرنے میں کوئی قباحت بھی نہیں تھی۔ موٹر سائیکل خریدنے کے بعد بھی اس کے پاس خاصی رقم بچی تھی۔ وہ تعلیم مکمل کر سکتا تھا۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔

''میں تمہاری طرف جس طرح کھنچتی ہوں، وہ خطرناک ہے کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں تم سے آج ہی شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی

کہ ہماری محبت کے دامن پر کوئی داغ لگے۔ میں جانتی ہوں، تم بھی اسی طرح محسوس کرتے ہو۔ ایسے میں ہم کب تک اس طرح لڑیں گے؟'' سمیرا نے اسے چونکا دیا۔

راشد نے نظریں اٹھا کر سمیرا کو دیکھا اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ آؤ۔۔۔ چلیں۔''

شادی کے بعد رزاق کے ہوٹل میں قیام مناسب نہیں تھا۔ اس کے کاروبار پر برا اثر پڑ سکتا تھا۔ راشد نے نیچے ایک ہوٹل میں کمرا لے لیا اور رزاق خان کو جا کر بتا دیا کہ اب وہ اس کے لیے کام نہیں کر سکے گا۔ اس نے واپس چلنے کی بھی تجویز پیش کی لیکن سمیرا کچھ روز وہیں گزارنا چاہتی تھی۔

کچھ بھی سہی۔ وقت بہت اچھا گزر رہا تھا۔ اختر ملک اور اس کی بیوی سعدیہ اسلام آباد واپس چلے گئے تھے۔ راشد کو ان پر ترس بھی آتا تھا۔ ایک ہی سال میں انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی گنوا دیا تھا اور اکلوتی بیٹی کو بھی۔ اور ان کے اس دہرے زیاں کا ذمے دار ایک ہی شخص تھا۔۔۔ وہ خود!۔۔۔ راشد نوید یا راشد حسن!

پھر وہ دونوں ایک دوسرے میں گم ہو گئے۔ ایک عجیب سی بے فکری اور سرشاری نے انہیں اسیر کر لیا۔ وہ دونوں ہی صحرا تھے مگر دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے دریا بھی تھے۔ وہ گھنٹوں بیٹھے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہتے۔

پھر ان کے بیچ وہ دیوار آ گئی جس کے متعلق راشد نے شادی کے وقت

سوچا بھی نہیں تھا۔ سمیرا کی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے اسے مظفر کا خیال آ جاتا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی اور سرشاری کے رنگ معدوم ہو جاتے۔ اسے خیال آتا کہ سمیرا اس سے شدید اور سچی محبت کرتی ہے اور اس محبت نے اسے کچھ حقوق دے دیے ہیں۔ وہ ان حقوق کی حد کا کبھی تعین نہ کر پاتا۔ وہ ان حقوق کے بارے میں سوچتے ہوئے خوف زدہ ہو جاتا۔ اس نے پہلے کبھی کسی کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کیا تھا۔۔۔۔ داخل ہونے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اور جب بھی کبھی کوئی اس کی زندگی میں اس کی مرضی کے خلاف داخل ہوا تھا تو اس کا انجام دکھ اور اذیت ہی رہا تھا۔ اور وہ دکھ سے۔۔۔۔ اور اذیت سے ہمیشہ ڈرتا آیا تھا۔

وہ یہ سوچ کر اداس ہو جاتا کہ اب یہ مزاحمت اس کی فطرت میں شامل ہو چکی ہے کہ خود سے کسی کو محبت نہ کرنے دے۔۔۔۔ اور نہ خود کسی سے محبت کرے۔ اب زندگی میں پہلی بار اس نے اجازت دی تھی۔۔۔۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ سمیرا اس سے محبت کرے۔ لیکن وہ خوف زدہ تھا کہ وہ سمیرا کو خود سے محبت نہیں کرنے دے گا۔ وہ بہت الجھ گیا تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے سمیرا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسے احساس ہو جاتا تھا کہ اب اس کی نگاہوں میں والہانہ پن' محبت' سرشاری اور مسرت کی جگہ اداسی کروٹیں لے رہی ہے۔ اور اگر سمیرا پوچھے تو وہ اس کی کوئی وضاحت بھی نہیں کر سکے گا لیکن وہ کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔

پھر ایک دن سمیرا نے اسے ٹوک ہی دیا۔ ''راشد۔۔۔۔ یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا ہو جاتا ہے اچانک؟''

وہ اس وقت بیڈ پر بیٹھے تھے۔ راشد اٹھا اور کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔

شام کا وقت تھا۔ افق سرخ ہو رہا تھا۔

سمیرا بھی اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے پُر تشویش لہجے میں پوچھا۔

''چلو' ٹہلنے چلیں۔۔۔۔'' راشد نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔

وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جناح روڈ پر ٹہلتے رہے۔ سمیرا باتیں کیے جا رہی تھی۔ لیکن راشد کا الجھا ہوا ذہن کہیں اور تھا۔ وہ محض ہوں ہاں کیے جا رہا تھا۔

سمیرا کی قربت میں عجیب سا سحر اور دل آویزی تھی۔ قربت کے لمحوں میں راشد کے ذہن میں کوئی الجھن نہ رہتی۔ اس وقت تو بھری کائنات میں بس وہ دونوں ہوتے کبھی کسی چیز کا خیال ہی نہ آتا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے بہت نرم و گداز اور مہربان ثابت ہوتے۔ وہ ایک دوسرے کو یوں برتتے' جیسے وہ انسان نہیں' نازک کانچ کا آئینہ ہوں۔ جو ایک ٹھیس سے ٹوٹ جاتا ہے۔ راشد کے لیے وہ جذبہ' وہ احساس بالکل ہی نئی چیز تھا۔ وہ ڈرتا کہ سمیرا کو کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے۔ وہ اسے کوئی مایوسی کوئی پچھتاوا نہیں دینا چاہتا تھا۔ مگر تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ جانتا تھا کہ اس کے دامن میں سمیرا کے لیے پچھتاووں اور اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ اس تصور ہی سے دہشت زدہ ہو جاتا کہ کبھی سمیرا کو اس سے کوئی تکلیف پہنچے گی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سمیرا بھی اس کو کوئی تکلیف پہنچنے کے۔۔۔۔ تکلیف میں دیکھنے کے تصور سے ڈرتی ہے۔ وہ اسے خطرات مول لیتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اس دوران شمشیر سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ شمشیر اسے جادوگر قرار دیتا تھا کہ اس نے سمیرا جیسی لڑکی کو تسخیر کیا ہے۔

''کیسی گزر رہی ہے دوست؟'' شمشیر نے پہلی ملاقات پر راشد سے پوچھا۔

''بہت اچھی۔ میں بہت خوش ہوں۔''

''تمہارے خوش ہونے سے زیادہ اہم سمیرا کا خوش ہونا ہے۔''

''وہ بھی بہت خوش ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ خوش

ہے۔'' راشد نے پوری سچائی سے جواب دیا۔

''اب تم اوپر بہت کم آتے ہو۔''

''ہم باہر کم ہی نکلتے ہیں۔''

شمشیر نے شرارت بھرا قہقہہ لگایا ''وہ تم پر چھا گئی ہے بری طرح۔۔۔''

''اور کمال یہ ہے کہ یہ مجھے برا نہیں لگتا۔''

''اور اب تم اس کے لیے بڑے آدمی بھی بنو گے۔''

''بڑا آدمی تو میں ہوں۔'' راشد نے سینہ پھلا کر کہا۔

اسی وقت سمیرا بھی آگئی۔ ''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟'' اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

''شمشیر کہتا ہے کہ تم سے شادی کے لیے میرا بڑا آدمی ہونا ضروری ہے۔ پہلے نہیں بن سکا تو اب بن جانا چاہیے۔'' راشد نے اسے بتایا۔

''راشد اب بھی بڑا آدمی ہے۔ مستقبل میں اور بڑا ہو جائے گا۔'' سمیرا نے شمشیر سے کہا۔

''یہ درست ہے۔ بڑا آدمی نہ ہوتا تو تم سے شادی کیسے کرتا۔'' شمشیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس کے جانے کے بعد سمیرا نے راشد سے پوچھا۔ ''تم اس سے ذاتی گفتگو تو نہیں کرتے۔۔۔ خاص طور پر میرے متعلق؟''

''ہرگز نہیں۔ کر بھی نہیں سکتا۔ ویسے بھی یہ خوبی تم لڑکیوں ہی میں ہوتی ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ بہر حال تم اس سے کبھی ایسی بات نہ کرنا۔ میں بھی کسی سے نہیں کرتی۔ ہمارے درمیان جو کچھ بھی ہے' میں اسے ایک حسین اور مقدس راز

کی طرح رکھنا چاہتی ہوں۔ طلوعِ آفتاب کا جو منظر ہم دیکھتے ہیں' پھولوں کی جو مہک ہمارے مشامِ جاں کو معطر کرتی ہے' ہوا کے جھونکے جو ہمیں چھوتے ہیں۔۔۔ اور ہماری آنکھیں ایک دوسرے سے جو کچھ کہتی ہیں۔۔۔ یہ سب حسین اور مقدس راز ہیں۔''

''اچھا۔''

''ہاں' بس یہ میرے اور تمہارے لیے ہیں۔ ہمارے درمیان ہیں۔ میں ان کا شائبہ بھی کسی کو نہیں دے سکتی۔ تم بھی نہ دینا۔'' وہ خوابناک لہجے میں بولی۔

سمیرا کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ راشد جانتا تھا کہ اس وقت وہ اس کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ اس نے سمیرا کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ بڑی نرمی سے اس کی پیشانی پر آئے ہوئے بال ایک طرف ہٹا دیے۔

کچھ دیر بعد وہ بولی۔ ''جانتے ہو' میں سب کچھ سمجھ گئی ہوں۔''

''کیا سمجھ گئی ہو؟'' راشد کے دل میں وسوسے جاگ اٹھے۔

''میں تمہیں پوری طرح سمجھ گئی ہوں راشد حسن!''

وہ مسکرا دیا لیکن اس مسکراہٹ میں خوشی نہیں تھی۔

''تم سننا چاہو گے؟'' سمیرا نے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔''

''میں نے جان لیا ہے کہ تم بے حد حساس ہو۔۔۔ تکلیف دہ حد تک حساس! وہ حساسیت اتنی شدید اور بے پناہ ہے کہ تمہیں اذیت دینے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔ تم بہت زیادہ محسوس کرتے ہو۔۔۔ اور بہت زیادہ گہرائی میں محسوس کرتے ہو۔ اتنی گہرائی میں کہ تمہیں محسوس کرنے سے ڈر لگتا ہے۔ تمہیں محبت کرنا بہت مشکل لگتا ہے۔ کیونکہ تم جانتے ہو کہ محبت بہت اذیت دیتی ہے۔ دوسرے لوگ محبت کرتے ہیں اور محبت کی دی ہوئی اذیت سہہ بھی لیتے ہیں لیکن تم اتنے حساس ہو

کہ سمجھتے ہو' وہ اذیت تمہیں مار ڈالے گی۔ ثامی سے محبت کرنا تمہاری ضرورت تھی۔ مگر تم اس سے محبت نہ کر سکے۔ تم جانتے تھے کہ وہ کتا ہے اور ایک نہ ایک دن مر جائے گا۔ تم جانتے تھے کہ محبت کی صورت میں تم اس کی موت برداشت نہیں کر سکو گے۔ کسی محبوب ہستی کی موت کا صدمہ تو تم جھیل ہی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے تم نے کسی کو محبوب نہیں ہونے دیا۔ ابھی چند روز پہلے تم نے اپنے کتے کا اپنے ہاتھوں گلا گھونٹا۔ وہ بہت بہادری کا کام تھا۔۔۔ شریفانہ بھی اور دشوار بھی۔ تم اس مرحلے سے صرف اس وجہ سے گزر گئے کہ کتے کے لیے تمہارے دل میں محسوسات ذرا بھی نہیں تھے۔''

راشد خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ سمیرا نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

''تم اس بچے کی طرح ہو جو ماں باپ کے غصے اور پٹائی سے بچنے کے لیے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیتا ہے۔ تم تعلقات قائم کرنے سے گریز کرتے ہو کیوں کہ تمہیں خوف ہے کہ تعلقات کسی بھی وقت تمہارے قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ تم محسوسات سے ڈرتے ہو کہ اگر تم نے ایک بار انہیں اپنا لیا تو انہیں پابند نہ رکھ سکو گے۔۔۔ حدود میں نہ رکھ سکو گے۔ وہ تم پر حاوی ہو جائیں گے۔ تم نے اپنے گرد غیر جذباتیت کا حصار قائم کر رکھا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ جب تک تم اس حصار میں ہو' محفوظ و مامون ہو۔''

راشد نے دل ہی دل میں کہا۔۔۔ مگر اب تو وہ حصار ٹوٹ چکا ہے۔

''ہر شخص تمہیں سرد مزاج اور تنہائی پسند سمجھتا ہے لیکن میں نہیں سمجھتی۔ میں جانتی ہوں' تم دنیا کے حساس ترین آدمی ہو۔''

راشد نے پھر بھی کچھ نہیں کہا۔ نہ اس نے اتفاق کیا نہ اختلاف۔ سمیرا چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ اس نے منہ چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ''میں ٹھیک

کہہ رہی ہوں نا؟''

راشد نے اس کا ہاتھ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں نے۔۔۔ مسکراہٹ سے سمیرا کو جواب دے دیا تھا کہ اس نے جو کچھ کہا درست ہے۔

راشد زندگی میں اتنا خوش کبھی نہیں رہا تھا۔ مگر پہلے کبھی اس نے کسی سے محبت بھی تو نہیں کی تھی۔ اسے ہر لمحے زندگی پر فتح مندی کا احساس ہوتا رہتا تھا۔ سمیرا بہت پیاری لڑکی تھی۔ محبت کرنے والی' نرم خو' گداز طبیعت اور خوب صورت۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اسے سمجھتی تھی۔۔۔ جانتی تھی۔ ورنہ اسے تو اس کے والدین نے بھی کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ خود بھی اپنے آپ سے اتنا واقف نہیں تھا۔ بہت سی باتیں تو اب سمجھ میں آ رہی تھیں۔ ماں نے ہمیشہ اس سے سرد مہری برتی تھی۔ محبت کی بھی تو اس کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔ اور پھر اس کے علم میں یہ بات آئی کہ اس کی ماں' اس کے باپ سے بے وفائی کر رہی ہے۔ یوں وہ صرف ماں کے احترام ہی سے محروم نہیں ہوا' بلکہ باپ کا احترام بھی گیا۔۔۔ اور صنفِ نازک کا احترام بھی۔ اب اسے خیال آتا تھا کہ اس نے صنفِ نازک پر اعتبار نہیں کیا۔ اس نے ہمیشہ اپنی وجاہت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے کھلونے کی طرح استعمال کیا۔۔۔ اس کی تحقیر کی۔ وہ جو ماں کو سزا دینے کی قدرت نہیں رکھتا تھا' اس کی صنف کو پیہم سزا دیتا رہا۔ اور اب وہ ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار تھا۔ صرف گرفتار نہیں' اسے ایک لمحے کے لیے بھی بے اعتباری کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس کے نزدیک بے حد محترم تھی۔ وہ اسے کوئی دکھ' کوئی تکلیف دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سمیرا نے اسے احساس دلایا تھا کہ وہ عمر بھر خود کو سمجھنے کی

بے سود کوشش کرتا رہا ہے۔ اسے حیرت ہوتی تھی کہ اسے اس بات کا احساس پہلے کیوں نہیں ہوا۔ اسے حیرت تھی کہ وہ سمیرا کی طرف اس طرح کیوں کھنچا۔ یہ کیفیت پہلے کبھی، کسی اور لڑکی کے ساتھ کیوں نہیں ہوئی۔ ان دونوں کے درمیان یہ کیسا تعلق استوار ہوا تھا۔ ایک جادو سا تھا۔ محبت، ایک دوسرے کی فکر، انڈراسٹینڈنگ۔۔۔ اور یہ سب کچھ بغیر کسی کوشش کے ہوا تھا۔ خود بخود ہوا تھا۔۔۔ جیسے پہلے سے موجود ہو۔ اور وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہ ناسمجھی اسے بری طرح الجھا رہی تھی۔ جو کچھ ہوا تھا غیر منطقی تھا۔۔۔ لیکن بہت اچھا۔۔۔ بہت خوب صورت بھی تھا۔

پہلے وہ بھوک کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ مگر اب بھوک اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی اور بھوک لگ بھی زیادہ رہی تھی۔ بعض اوقات کھانا کھانے کے آدھے گھنٹے بعد پھر بھوک لگتی تھی۔ دس دن میں اس کا وزن تین پونڈ بڑھ گیا تھا۔ اسے اپنا آپ بھاری لگنے لگا۔ جسمانی فٹنس کا خیال ایک طرف رکھا رہ گیا۔ سمیرا نے اسے عجیب سا احساسِ تحفظ دیا تھا۔ اسے اعتماد تھا کہ وہ موٹا اور بھدا ہو جائے تب بھی سمیرا اس سے اسی طرح محبت کرے گی اور یہ احساس اس کے لیے بالکل نیا اور اجنبی تھا۔

لوگ اس کے بارے میں کس انداز میں سوچتے ہیں۔۔۔ اس کی اسے کبھی پروا نہیں رہی تھی۔ اب بھی نہیں تھی۔ مگر اسے اپنے بارے میں سمیرا کے خیالات اور اس کی رائے کی پروا تھی۔ اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ سمیرا پر اس کی شخصیت کا کوئی ناگوار تاثر مرتب ہو۔ اسے کبھی یہ خیال آتا کہ سمیرا کبھی کسی بات پر اسے برا سمجھے گی تو اس کی اذیت کی کوئی حد نہ رہتی۔

وہ سوچتا کہ سمیرا کو کبھی نہیں بتائے گا کہ اس نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔۔۔ کتنی زیادتی کی ہے۔ وہ راشد نوید نامی ایک شخص سے نفرت کرتی تھی۔

اور وہ نفرت معقول اور فطری تھی۔ اور وہی راشد نوید، راشد حسن بن کر اس سے ملا تھا۔۔۔ اور وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ لیکن وہ محبت سمیرا کے دل سے راشد نوید کی نفرت کو نہیں دھکیل سکی تھی۔ دونوں متصادم جذبے اپنی اپنی جگہ موجود تھے۔ وہ ان میں سے کسی کو مٹا سکتا تھا تو وہ صرف اور صرف محبت تھی۔

راتوں کو سمیرا کے سو جانے کے بعد وہ جاگتا اور پریشان رہتا۔۔۔ وہ سمیرا کے ساتھ بے ایمانی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک دن اسے سمیرا پر یہ راز کھولنا ہوگا اور راز جتنی دیر میں کھلے گا، اذیتیں اور پیچیدگیاں اتنی ہی زیادہ ہوں گی۔ وہ خوف زدہ تھا۔ اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی بات سے ڈر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہمیشہ ہر صورتِ حال کا پوری طرح تجزیہ کرنے کا قائل تھا۔ اس طرح بے خبری دور ہو جاتی تھی اور صرف حقائق اس کے سامنے ہوتے تھے۔ جب کہ اس وقت وہ ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار تھا جہاں ہر چیز نامعلوم تھی۔۔۔ ہر بات معما تھی۔ سب کچھ جاننے پر سمیرا کا کیا رَدِعمل ہوگا؟ کیا وہ اسے معاف کر سکے گی؟ وہ کوئی بات یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ باقی ہر بات تو سمیرا نے سمجھ لی تھی۔ ممکن ہے، یہ بات بھی سمجھ جائے لیکن یہ محض ایک امکان تھا۔ اب وہ خود کو وِلن محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنا وجود برا لگنے لگا تھا۔

اس عرصے میں سمیرا نے ایک بار اور اس کی کھنچائی کی تھی۔ وجہ وہی تھی۔۔۔ پرانی وجہ۔۔۔ موٹر سائیکل چلانے میں بے پروائی اور شوبازی۔ راشد نے فوراً ہی معذرت کر لی تھی۔۔۔ اور دل سے تائب بھی ہو گیا تھا۔

اس کا یہ اندازہ بھی درست نکلا کہ وہ ٹینس کھیلتی ہے۔ ایک دن وہ مری کلب گئے اور انہوں نے ٹینس کھیلی۔ سمیرا کی سروس بہت اچھی تھی۔ ورنہ لڑکیاں عموماً اچھی سروس سے محروم ہوتی ہیں۔ کھیل کے معاملے میں وہ اس کے یونیورسٹی

کے ساتھیوں سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ اس کی ریٹرن بہت تیز' اچھی اور ذہانت سے بھرپور ہوتی تھی۔۔۔۔ دھوکا دینے والی۔ راشد کو اس کے ساتھ کھیل کر خوشی ہوئی۔ کئی مہینوں سے وہ اتنی اچھی ٹینس نہیں کھیل سکا تھا۔ جب کہ اسے اس کھیل سے عشق تھا۔ سمیرا بہت اچھا کھیل رہی تھی۔ راشد کی اچھی خاصی ورزش ہو گئی۔ اور سمیرا بہت سنجیدگی سے کھیل رہی تھی۔۔۔۔ جیتنے کے لیے! راشد نے زندگی میں پہلی بار خوشی سے اپنی شکست قبول کی۔۔۔۔ اور اسے وہ شکست بہت اچھی بھی لگی۔ سمیرا کو خوش دیکھ کر اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ بظاہر مقابلہ بہت سخت ہوا۔ دونوں کی رفتار میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ مگر جتنا بھی تھا' راشد کے جیتنے کے لیے بہت کافی تھا۔ مگر راشد نے سمیرا کو اندازہ ہی نہیں ہونے دیا۔ سمیرا کے جیتنے پر شمشیر نے خوب تالیاں پیٹیں۔

سمیرا اپنے گھر' اپنے والدین کے بارے میں کثرت سے گفتگو کرتی تھی۔ وہ اسے اپنے اسلام آباد والے گھر کے متعلق بتاتی۔ وہ بڑی صاف گوئی اور سچائی سے سب کچھ بتاتی۔۔۔۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ وہ سب کچھ راشد کے سینے میں محفوظ رہے گا۔ کئی بار اس نے مظفر کی موت کے بارے میں بھی گفتگو کی۔ راشد خاموشی سے مگر دلچسپی سے سنتا لیکن وہ اپنے بارے میں کبھی بات نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے ماضی کے۔۔۔۔ اپنے پس منظر کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ اور پھر بتانے کو بھی تو بہت کچھ تھا۔

وہ پہلا موقع تھا کہ راشد کو مظفر کی کمی محسوس ہوئی۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو وہ اسے خط لکھتا۔۔۔۔ بتاتا کہ وہ کتنا خوش ہے۔ کتنا اچھا وقت گزر رہا ہے۔ وہ مظفر سے دل کی بات' اپنے خیالات اور اپنے خواب سنانے سے کبھی نہیں ہچکچاتا تھا۔ ویسے ان دونوں کے درمیان خط و کتابت کم ہی ہوتی تھی۔ لیکن وہ جب بھی خط لکھتے' وہ دل کی باتوں سے عبارت ہوتا۔ کیا سوچا جا رہا ہے۔۔۔۔ کیا دیکھا جا رہا ہے۔

کیا کیا جا رہا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔۔۔۔ اور ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپاتے تھے۔ اسی لیے راشد کو حیرت تھی کہ مظفر نے اس سے ثمینہ کے بارے میں کیوں بات نہیں کی۔ شاید وہ سمجھ بیٹھا ہو کہ وہ ثمینہ میں دلچسپی رکھتا ہے حالانکہ راشد نے بارہا واضح کر دیا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔

اب راشد اپنی زندگی کے خوش گوار ترین دنوں کے بارے میں کسی کو بتانا چاہتا تھا تو پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے عزیز ترین دوست کو کھو بیٹھا ہے۔ اب وہ کسے بتاتا اور کیسے بتاتا کہ وہ خود کو ہیرو نہیں' ولن محسوس کرتا ہے۔۔۔۔ اور یہ کہ اسے جو خوشیاں ملی ہیں' وہ ان کا حق دار نہیں تھا۔۔۔۔ نہیں ہے۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ آتی بھی تو کیسے۔ جس لڑکے کی خودکشی کے بارے میں بات کرتے کرتے سمیرا دکھی ہو جاتی' وہ صرف راشد کا دوست نہیں تھا' سمیرا کا بھائی بھی تھا۔ سمیرا اس سے۔۔۔۔ راشد حسن سے محبت کرتی تھی۔ لیکن وہ راشد نوید سے نفرت بھی تو کرتی تھی اور راشد نوید۔۔۔۔ ولن وہ خود تھا۔

راشد دل کا یہ بوجھ کسی کے سامنے ہلکا کرنا چاہتا تھا مگر اس کی زندگی میں کوئی ایسا دوست نہیں تھا۔ ایک تھا تو اسے اس نے خود گنوا دیا تھا۔ اور دوست اس نے بنائے ہی کب تھے۔ کون اسے سمجھاتا کہ اس گتھی کو کیسے سلجھایا جائے۔۔۔۔؟ اس نے مظفر کی خودکشی کی وجہ سمجھنے کی کوشش بھی کی تھی۔ مگر وہ بے سود ثابت ہوئی اس نے سوچا تھا کہ شاید سمیرا اس سلسلے میں زیادہ جانتی ہو۔۔۔۔ کچھ مدد کر سکے۔۔۔۔ معلومات فراہم کر سکے۔ مگر نتیجہ صرف یہ نکلا کہ وہ خود کو ایک تنگ دائرے میں گھومتا محسوس کرنے لگا۔ وہ سمیرا کو زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع دیتا۔۔۔۔ اور اس کی باتیں خاموشی سے سنتا رہتا۔۔۔۔ اس امید پر کہ شاید کبھی سمیرا کی زبان سے عقدہ کشا جملہ ادا ہو جائے لیکن اس کی معلومات میں کبھی کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

اسے خود سے مایوسی بھی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ کبھی کسی سے محبت

نہیں کر سکے گا۔۔۔ نہیں کرے گا۔ مگر اسے محبت ہو گئی تھی۔ نہ صرف ہو گئی تھی بلکہ وہ محبوب ہستی اس کے مرحوم دوست مظفر کی بہن تھی۔۔۔ اور مظفر کی موت سے اس کا خود کا گہرا تعلق تھا۔ اب وہ مظفر کی خودکشی کے سلسلے میں سمیرا کا نقطۂ نظر سمجھنا چاہتا تھا مگر اسے اس میں بھی ناکامی ہوئی تھی۔

بالآخر ایک دن اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہتا تھا۔ وہ جو محبت کا قائل بھی نہیں تھا اور اہل بھی نہیں تھا' اسے سمیرا نے وہ محبت دی تھی جس کا کوئی بدل نہیں تھا۔ اور وہ اسے دھوکا دے رہا تھا۔ اس نے اس سے چھپایا تھا کہ وہ درحقیقت وہ شخص ہے جس سے وہ دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کرتی ہے۔ اسے احساس ہو گیا کہ فریب کے سہارے زندگی گزار کر خوش نہیں رہا جا سکتا۔ کون جانے' کتنی عمر پڑی ہے' آدمی تمام عمر تو جھوٹ نہیں بول سکتا۔

چنانچہ اس نے خود ہی اپنے فریب کا پردہ چاک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔۔۔

اس روز وہ بہت چپ چپ تھا۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا جیسے طبیعت خراب ہو۔ سمیرا نے دو ایک بار اسے پکارا مگر اس نے اس کی آواز نہیں سنی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج سمیرا کو سب کچھ بتا دے گا۔ اسے احساس تھا کہ اس کی سنجیدگی اور چہرے کے سنگین تاثر نے سمیرا کو خوف زدہ کر دیا ہے۔ سمیرا کے چہرے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خود کو کسی ان ہونی کے لیے تیار کر رہی ہے۔ حالانکہ وہ نوعیت کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتی تھی۔

راشد کو احساس تھا کہ جو کچھ اسے کہنا ہے' وہ بے حد دشوار ہے۔ کچھ دیر وہ سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''سمیرا۔۔۔ جانتی ہو' میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں؟'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم ہر بات سے پہلے اور ہر بات کے بعد اس حقیقت کو یاد رکھو۔ یہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس لیے بھی کہ میں نے اس سے پہلے یہ لفظ کبھی کسی سے نہیں کہے۔۔۔ کسی سے بھی نہیں کہے۔ نہ ہی میں نے پہلے کبھی کسی کے لیے اپنے دل میں محبت محسوس کی تھی۔ میں تم سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔۔۔ اتنی کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔''

سمیرا جانتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے' لفظ بہ لفظ درست ہے۔ ''میں جانتی ہوں راشد' اور یہ محبت میری زندگی کا حاصل ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''لیکن مجھے ایک خوف ناک بات بتانا ہے تمہیں۔''

یہ تجسس اب سمیرا کے لیے ناقابل برداشت ہوا جا رہا تھا۔

راشد نے بہت آہستگی سے۔۔۔ ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''سمیرا۔۔۔ میرا نام راشد نوید ہے۔''

''مجھے معلوم۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رکی۔ اس کے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ پھر جیسے اچانک اس کے اعتراف کی۔۔۔ اس جملے کی اہمیت اور معنویت اس پر واضح ہوئی۔ ''اوہ مائی گاڈ۔۔۔ تم۔۔۔ تم راشد نوید ہو۔۔۔ مظفر کے دوست!'' اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ راشد کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔

راشد نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔ وہ بری طرح سسک رہی تھی۔

''سمیرا۔۔۔ تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں؟'' راشد گڑگڑایا۔ ''تم نے مجھے دوسروں سے بہتر سمجھا ہے۔ تم سمجھ نہیں سکتیں' مجھے معاف نہیں کر سکتیں۔''

''مجھے یقین نہیں آتا۔۔۔۔ میں یقین نہیں کرسکتی۔'' وہ ہذیانی انداز میں بڑبڑانے لگی۔

راشد اسے روتے' ہچکیوں کی لے پر اس کے لرزتے جسم کو بیڈ پر بکھرتے دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اسے اپنے جسم میں سے زندگی دھیرے دھیرے نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کا دُکھ پوری طرح محسوس کرسکتا تھا۔ حالاں کہ اس نے کبھی خود کو بھی پوری طرح نہیں سمجھا تھا۔۔۔۔ نہیں محسوس کیا تھا۔ وہ مجرم تھا۔ اسے خود پر شرم آرہی تھی۔ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس کی سسکیاں سنتے سنتے اس نے خود اپنی زبان دانتوں سے کاٹ ڈالی۔ وہ اس وقت کوئی بہت بڑی تکلیف اٹھانا چاہتا تھا۔۔۔۔ تاکہ ضمیر کا بوجھ کچھ کم ہو جائے۔ مگر زبان پر خون کے نمکین ذائقے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ بہت بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ وہ تو اسے اذیت دینے سے مرجانا بہتر سمجھتا تھا۔

سمیرا اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اسے سوٹ کیس پیک کرتے دیکھتا رہا۔ مگر نہ منہ سے کچھ بولا' نہ اپنی جگہ سے ہلا۔ اس کا جسم جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ وہ سوٹ کیس پیک کر کے کمرے سے نکلی تو وہ اس کے پیچھے لپکا۔ وہ لاری اڈے کی طرف جا رہی تھی۔

''کہاں جا رہی ہو سمیرا؟''

''میں گھر واپس جا رہی ہوں۔'' سمیرا نے رُکے بغیر جواب دیا۔ اس کی آواز چیخ رہی تھی۔ وہ کسی سہمی ہوئی ننھی سی بچی کی آواز تھی۔ اس آواز نے راشد کا دل چیر ڈالا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

''تم نے ایسا کیوں کیا راشد؟ تم کیوں آئے؟ تم نے مجھے اپنی محبت میں کیوں الجھایا؟ کیا ہو گیا تھا تمہیں؟''

راشد کی آواز لرز رہی تھی۔ سڑک پر نظریں جمانا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں سمیرا یقین کرو۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یوں ہو گا۔ سمیرا میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

وہ خاموشی سے قدم قدم چلتے رہے۔ سمیرا چپکے چپکے روئے جا رہی تھی۔ راشد کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ مر جائے۔۔۔۔ یہیں۔۔۔۔ اسی وقت!

''تم کبھی مجھے معاف نہیں کرسکو گی؟'' راشد نے چلتے چلتے کہا۔

''ممکن ہے راشد' میں تمہیں معاف کر دوں۔ لیکن میں نے ایسا کبھی کیا تو میں کبھی خود سے بھی نہیں مل سکوں گی۔۔۔۔ اپنے ساتھ کبھی نہیں رہ سکوں گی۔''

سمیرا پنڈی جانے والی ویگن میں بیٹھ گئی۔ راشد خاموش کھڑا اسے تکتا رہا۔ وہ اس سے نظریں چراتی رہی۔ راشد اس سے کہنا چاہتا تھا کہ واپس آ جاؤ۔۔۔۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ لیکن وہ کس منہ سے کہتا۔

ویگن چلی گئی۔ وہ موڑ مڑنے تک خالی خالی نظروں سے اسے تکتا رہا۔ پھر پلٹ کر واپس چل دیا۔ اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خوب توڑ پھوڑ مچائے۔ کانچ کی چیزیں توڑ ڈالے بلکہ دنیا ہی کو تہس نہس کر دے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔ اس نے سانسیں ہموار کرنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی مگر ناکام رہا۔ بے ترتیب سانسیں ان تیز ہواؤں کی طرح تھیں جو گھنے درختوں کی شاخوں سے الجھ کر شور مچاتی ہیں۔ اس نے اپنے ہونٹ کاٹ ڈالے لیکن سانسوں کا زیر و بم وہی رہا۔۔۔۔ جسم ویسے ہی لرزتا رہا۔

کمرے میں پہنچ کر وہ ٹھنڈے پانی سے نہایا۔ جسم بہت نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ پیٹ کے بل بستر پر گر کر رونے لگا۔ اسے یاد نہیں آتا تھا کہ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ کبھی رویا ہے۔ آنسوؤں کا ذائقہ لبوں پر۔۔۔۔ اور زبان پر بے حد

عجیب اور نامانوس لگ رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ روتا رہا۔۔۔۔

اگلے روز شمشیر اس سے ملنے آیا تو وہ بستر پر اسی طرح پڑا تھا نیم جاں۔ اسے بستر پر گرے ہوئے بیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں اس نے نہ کچھ کھایا تھا نہ کچھ پیا تھا۔ نقاہت اتنی زیادہ تھی کہ اٹھنے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ شمشیر اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا لیکن اسے کام پر جانا تھا۔ اس نے چھٹی کرنا چاہی لیکن راشد نے اسے سختی سے منع کر دیا۔

''سمیرا کہاں ہے؟'' شمشیر نے پوچھا۔

''وہ کچھ دن کے لیے اسلام آباد چلی گئی ہے۔''

''کوئی گڑبڑ تو نہیں؟''

''گڑبڑ کیا ہو سکتی ہے؟''

شمشیر مطمئن تو نہیں ہوا' تاہم چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد راشد بستر پر لیٹا رہا۔ کمزوری بہت زیادہ تھی۔ وجود میں عجیب سی تھکن اتر آئی تھی۔ اس نے خود کو اتنا کمزور' اتنا مردہ کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کے خیال میں وہ روحانی تھکن تھی جس نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

دوپہر کے قریب وہ اٹھا۔ بھوک اب بھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ کمرے میں ٹہلتا رہا۔ کبھی کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو جاتا۔ اس نے کہانیوں کا ایک مجموعہ اٹھایا اور اسے پڑھنے کی کوشش کی مگر وہ ارتکاز سے محروم تھا۔ پھر وہ جا کر سگریٹ کا پیکٹ خرید لایا۔ وہ سگریٹ باقاعدگی سے نہیں پیتا تھا۔ مگر انتشار کے عالم میں

سگریٹ سے بڑی مدد ملتی تھی۔ اس نے ایک کے بعد ایک' چار سگریٹ پھونک ڈالے لیکن اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔

شام کے وقت اس نے تھوڑا سا کھانا زہر مار کیا۔ پھر وہ موٹر سائیکل لے کر نکل کھڑا ہوا۔ کچھ دیر وہ بے مقصد موٹر سائیکل دوڑاتا رہا۔ پھر اس نے رزاق خان کے ہوٹل کا رخ کیا۔ اسے احساس تھا کہ وہ سمیرا کے گھر جانا چاہتا ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ بے سود ہو گا۔ سمیرا اس کے پاس سے گئی تھی تو بہت برے حال میں تھی۔ اسے ذہنی صدمہ پہنچا تھا۔ تقریباً ہسٹریائی سی کیفیت تھی اس کی۔ اس نے جا کر یقیناً اپنے والدین کو سب کچھ بتا دیا ہو گا۔ بات اگر سمیرا کی حد تک رہتی تو یقیناً بہتری کی کوئی صورت نکل آتی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اختر ملک اور سعدیہ ملک سب کچھ جاننے کے بعد سمیرا کو اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھنے دیں گے۔ وہ اسے کبھی سمیرا سے ملنے نہیں دیں گے۔۔۔۔ کبھی بات نہیں کرنے دیں گے۔

لیکن وہ سمیرا کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ سمیرا ٹھیک ٹھاک ہے یا نہیں۔ وہ اس صدمے سے کس انداز میں گزر رہی ہے۔ کیا گزر رہی ہے اس پر۔ وہ سوچتا رہا کہ شاید کوئی صورت نکل آئے۔ وہ شمشیر سے فون کروا سکتا تھا۔ لیکن اس صورت میں سمیرا فوراً سمجھ جائے گی کہ درحقیقت بات وہ کرے گا۔

اس کے باوجود اس نے اس ترکیب پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے شمشیر کو فون کرنے پر رضامند کر لیا۔

''میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔'' شمشیر نے کہا۔ تاہم وہ فون کرنے پر رضامند ہو گیا۔

لیکن نتیجہ وہی نکلا۔ سمیرا نے شمشیر کا نام سنتے ہی فون رکھ دیا۔

راشد کا اندازہ تھا کہ سمیرا کو سنبھلنے کے لیے کم از کم دو ہفتے کی مہلت درکار ہو گی۔ پھر وہ شاید اس سے ملنا گوارا کر لے۔ لیکن دو ہفتے سمیرا کے بغیر گزارنے کا

تصور بھی اس کے لیے جان لیوا تھا۔ اس کی منضبط زندگی کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا تھا۔ پہلے اس نے زندگی میں کبھی کوئی کام بے قاعدگی سے نہیں کیا تھا۔ وہ زندگی میں نظم اور ترتیب کا قائل تھا۔ لیکن اب تو اسے خود پر اختیار ہی نہیں رہا تھا۔ کسی کی بات سنتا تو بے دھیانی سے۔۔۔۔ اور خود کوئی بات ہی نہ کرتا۔ زیادہ وقت تنہا بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہتا۔

شمشیر کو اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن شمشیر سمجھتا تھا کہ راشد اور سمیرا کے درمیان کوئی بہت بڑی بات ہو گئی ہے۔ لیکن ظاہر ہے' وہ وجہ کبھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ صورتِ حال کی سنگینی اس کی سمجھ سے بہت زیادہ بالاتر تھی۔ تاہم وہ راشد کا دل بہلانے کی بھرپور کوشش کرتا تھا۔

ایک دن وہ راشد کو مری کلب لے گیا۔ اس نے لوگوں کو ٹینس کھیلتے بارہا دیکھا تھا۔ مگر خود کبھی کھیلا نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے راشد کی خاطر اس سے کھیلنے پر اصرار کیا۔ وہ شور مچاتا' چہکتا رہا لیکن اس کا تجربہ ناکام ثابت ہوا۔ راشد بے دلی سے کھیلتا رہا جیسے الٹا شمشیر کا دل رکھ رہا ہو۔ پھر اس نے جھنجلا کر ریکٹ ایک طرف پھینک دیا۔

اس شام شمشیر اس کے کمرے میں رات بارہ بجے تک بیٹھا رہا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ راشد اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لے۔ مگر جب وہ تھک ہار کر اپنے ہوٹل کی طرف واپس چلا' تب بھی اس کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔

اب راشد کا صرف ایک ہی رفیق تھا۔۔۔۔ اس کی موٹر سائیکل۔ وہ موٹر سائیکل اٹھاتا اور کسی بھی طرف نکل جاتا۔ وہ نتھیا گلی تک ہو آیا لیکن اس نے دیکھا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ نتھیا گلی کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ کھانے پینے کی اسے بالکل پروا نہیں رہی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ورزش بھی چھوڑ دی تھی۔ نتیجہ یہ کہ وہ بہت کمزور لگنے لگا تھا۔

دو ہفتے کا عرصہ اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ ادھر سیزن ختم ہو چکا تھا۔ بیشتر ہوٹل بند ہو چکے تھے۔ سڑکوں پر سناٹا طاری رہنے لگا۔ شمشیر بھی واپس چلا گیا تھا۔ کوئی تنہائی سی تنہائی تھی۔ ان دس بارہ دنوں میں اس نے کسی سے تعلق نہیں رکھا پھر یہ کہ بنیادی طور پر وہ تنہائی پسند بھی تھا۔ اس کے باوجود اس تنہائی سے اب اسے وحشت ہونے لگی تھی۔

سوچنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ خود کو بدترین نتائج کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اپنے تمام جذبے' تمام تعلقات' تمام اہم لوگوں کی شخصیات ذہن کے نہاں خانوں سے نکال کر اپنی گود میں پھیلا کر بیٹھ جاتا تاکہ ان کا تجزیہ کر سکے' ان کی اہمیت کے لحاظ سے ترجیحات کا تعین کر سکے۔ ممی' ڈیڈی اور اختر ملک' سعدیہ ملک اور سمیرا ملک' جو اَب سمیرا راشد تھی۔ سمیرا نے بتایا تھا کہ ان کے ہاں گھریلو جھگڑے بکثرت ہوتے تھے۔ دو ایک بار تو اختلافات بہت ہی شدید ہو گئے تھے۔ تاہم راشد کے والدین کے برعکس سمیرا کے والدین جدا جدا زندگی گزارنے کے قائل نہیں تھے۔ وہ ایک دوسرے کے معاملات میں دخیل ہوتے تھے۔ راشد فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کے والدین بہتر ہیں یا سمیرا کے۔ اس کے گھر کا ماحول زیادہ اچھا ہے یا سمیرا کے گھر کا۔

تاہم اس کا خیال تھا کہ مظفر کی موت کے سلسلے میں اس کے والدین احساسِ جرم کا شکار تھے۔ انہوں نے بھی اس کے والدین کی طرح اپنے بیٹے کو توجہ' محبت اور شفقت سے محروم رکھا تھا۔ وہ بس صرف ضروریات پوری کر دینے کو محبت کا نام دیتے تھے۔ چنانچہ مظفر کی موت کے بعد انہیں احساسِ جرم ستاتا ہوگا۔ مگر اب اگر سمیرا نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا تو انہیں اپنے احساسِ جرم سے چھٹکارا پانے کی سبیل نظر آ گئی ہوگی۔ انہیں اس کی صورت میں وہ کندھا مل گیا ہوگا جس پر اپنا بوجھ۔۔۔۔ اپنا احساسِ جرم لاد کر خود ہلکا پھلکا ہوا جا سکے۔

مگر تجزیئے سے اسے حاصل کچھ نہ ہوا۔ صورتِ حال کی پیچیدگی اپنی جگہ تھی۔ اس کی سنگینی کسی طور بھی کم نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے احساسِ شکست بھی ستاتا تھا۔ اپنے جذبات پر اس کی گرفت نرم پڑتی جا رہی تھی۔ یہ وہ شکست تھی جس کا کبھی اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

دو ہفتے تک اس نے کسی طرح خود کو باندھے رکھا۔ دو ہفتے پورے ہوتے ہی اس کا ضبط جواب دے گیا۔ سمیرا کا اسلام آباد والا پتا اس کے پاس تھا۔ شام کو اس نے موٹر سائیکل نکالی اور اسلام آباد کی طرف چل دیا۔

اختر ملک کا بنگلہ شہر کے جس سیکٹر میں تھا' وہ ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ راشد وہاں پہنچا تو بوندا باندی شروع ہوگئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بادل زور سے برس پڑے۔ راشد نے موٹر سائیکل دیوار کے ساتھ کھڑی کی اور گیٹ کی طرف لپکا۔ گیٹ تک پہنچتے پہنچتے وہ خاصا بھیگ گیا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اس نے اسے دھکیلا اور تیز قدموں سے صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اب وہ بارش سے بہر حال محفوظ تھا۔

گھنٹی کے جواب میں ایک خادمہ نے دروازہ کھولا۔ وہ ہچکچائی۔ لیکن اُس کا پُر اعتماد انداز دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئی اور اسے راستہ دے دیا۔ پھر اس نے ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کیا۔

سمیرا اور اس کی ماں آتش دان کے قریب والے دیوان پر بیٹھی تھیں۔ اختر ملک ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ دروازے کی طرف اس کی پشت تھی۔ کمرا بے حد وسیع و عریض تھا اور بہت خالی خالی لگ رہا تھا۔

سمیرا اور سعدیہ نے فوراً ہی راشد کو دیکھ لیا۔ انہیں دیکھ کر اختر ملک نے بھی پلٹ کر اسے دیکھا۔ راشد کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ وہ اپنی زندگی کے بدترین انسانی رویے کا۔۔۔۔خوف ناک ترین تجربے کا سامنے کرنے والا ہے۔ اسے احساس ہو گیا کہ اسے پوری شدت سے رد کیا جائیگا۔ لیکن وہ منہ نہیں چھپا سکتا تھا۔ اسے حقائق کا سامنا کرنا تھا۔ اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ اسے یہ کرب ان تینوں کی خاطر سہنا ہوگا۔ اس سے انہیں فائدہ ہوگا۔ وہ ہلکے ہو جائیں گے۔ ان کے دل کی بھڑاس نکل جائے گی۔ اسے معلوم تھا کہ اس پر جذبات کے تھپڑ برسنے والے ہیں۔ اسے نفرت کا سامنا کرنا ہے۔ اس نے خود کو اس رول کے لیے تیار کر لیا جو اسے ادا کرنا تھا۔ پھر اس نے ایک لمحے کو سوچا کہ اس کرب سے اسے بھی کچھ حاصل ہوگا یا نہیں۔ پھر اس نے اس سوال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ کچھ ملے یا نہ ملے۔ اس کرب سے تو بہر حال گزرنا ہے۔ وہ راضی بہ رضا ہو گیا۔

اختر ملک اتنی تیزی سے کرسی سے اٹھا کہ کرسی الٹ گئی۔ ''خدا کی پناہ۔۔۔تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' وہ غرایا۔

''میں سمیرا کو دیکھنے آیا ہوں کہ وہ خیریت سے ہے یا نہیں۔'' راشد نے نرم لہجے میں کہا۔

سمیرا اور سعدیہ اپنی جگہ بیٹھی اسے یوں تکے جا رہی تھیں جیسے انہیں سکتہ ہو گیا ہو۔۔۔۔پھر سعدیہ نے یوں سمیرا کا ہاتھ تھاما' جیسے اسے کسی آفت سے بچانا چاہ رہی ہو۔۔۔۔احساسِ تحفظ فراہم کر رہی ہو۔ سمیرا نے آنکھیں موند لیں۔

''سمیرا تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔'' اختر ملک نے چیخ کر کہا۔

راشد سمیرا کو بغور دیکھتا رہا۔ وہ بے حد کمزور اور زرد ہوگئی تھی۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے تھے۔ ''یہ فیصلہ سمیرا ہی کو کرنے دیں کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے یا نہیں۔''

''میں جو تمہیں بتا رہا ہوں۔ سمیرا تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔''
اختر ملک کی آواز اور بلند ہوگئی۔ ''تم اسی وقت نکل جاؤ یہاں سے۔ دفع ہو جاؤ۔''

راشد کو اس کی آنکھوں سے شعلے نکلتے دکھائی دیے۔ اسے ہلکی سی حیرت ہوئی۔ اتنے شدید ردِعمل کی تو اسے توقع بھی نہیں تھی۔

''تم بہت خبیث ہو۔۔۔ ذلیل!'' سعدیہ ملک نے کہا۔ وہ اب سمیرا کا ہاتھ تھپتھپا رہی تھی۔

''بس۔۔۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ ہم تمہیں ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہیں کرسکتے۔'' اس بار اختر ملک نے چنگھاڑ کر کہا۔

''سمیرا!'' راشد نے پکارا۔

سمیرا نے سر اٹھا کر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''راشد۔۔۔ تم چلے جاؤ۔ میں اب تمہیں کبھی نہیں دیکھنا چاہتی۔۔۔ کبھی نہیں ملنا چاہتی تم سے۔۔۔'' اس کے لہجے میں دکھ تھا۔ اس نے یوں رُک رُک کر الفاظ ادا کیے تھے جیسے انہیں ادا کرنا دنیا کا دشوار ترین کام ہو۔ اس نے بمشکل اپنی سسکیوں پر قابو پایا۔

اس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ راشد کے دل میں خنجر کی طرح اتر گیا۔ وہ نفرت کی' تذلیل کی توقع لے کر آیا تھا۔ پھر بھی اس کے لیے یہ سب کچھ سہنا بہت دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ لیکن زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے تھے۔ وہ کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے جنبش نہ کرسکا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں۔ وہ بے بس' ساکت وصامت کھڑا رہا۔ پھر اسے خود پر شرم آنے لگی۔ ان تینوں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔ انہوں نے جان لیا تھا کہ وہ شکست خوردہ ہے۔۔۔ کمزور ہے۔ شاید اسی لیے اختر ملک دیوانوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔ وہ بری طرح دھاڑ رہا تھا۔۔۔ اسے دھکیل رہا تھا۔۔۔ دیوانہ وار مار رہا تھا۔ راشد

کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بچاؤ کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے تھے۔ اب اسے دکھائی کچھ نہیں دے رہا تھا۔ البتہ وہ سن سکتا تھا۔۔۔ محسوس کرسکتا تھا۔ سعدیہ ملک بری طرح چیخ رہی تھی۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ اس کے جسم پر تھپڑ گھونسے پڑ رہے تھے۔ وہ لرز رہا تھا مگر اسے تکلیف کا مطلق احساس نہیں تھا۔

''پلیز راشد۔۔۔ راشد پلیز۔۔۔ چلے جاؤ یہاں سے۔۔۔ پلیز۔۔۔۔'' سمیرا کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

وہ پلٹا اور اندھا دھند دروازے کی طرف بھاگا۔ باہر بارش نے اس کے اوسان کسی حد تک بحال کردیے۔ مگر وہ پوری طرح اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ وہ جیسے تیسے گیٹ سے نکلا' موٹر سائیکل کو اسٹینڈ سے ہٹا کر اس نے کک لگائی۔ اس کی نظریں صدر دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ باؤنڈری وال چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ صاف نظر آ رہا تھا۔ پورچ روشن تھا۔

موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوگئی تھی۔ اسی لمحے صدر دروازہ کھلا اور اختر ملک نمودار ہوا۔ اس نے راشد کی طرف انگلی اٹھائی! اگلے ہی لمحے فضا میں فائر کی آواز گونجی۔ تب راشد کی سمجھ میں آیا کہ وہ ریوالور ہے۔ دوسرا فائر ہونے سے پہلے راشد نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے بڑھا دی۔ اس کے باوجود اختر ملک نے دو فائر اور کیے۔

اب وہ مری جانے والی سڑک پر تھا۔ موٹر سائیکل کی رفتار بہت زیادہ تھی اور وہ جانتا تھا کہ یہ سڑک جو ویسے بھی خطرناک ہے' رات کے وقت زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے مگر اس نے موٹر سائیکل کی رفتار کم نہیں کی۔ سڑک پر کئی جگہ پے در پے خطرناک موڑ آتے تھے۔ ان پر اتنی رفتار سے موٹر سائیکل چلانا مہلک ثابت ہوسکتا تھا مگر وہ اس وقت ہوش میں نہیں تھا۔

اب وہ سوچ رہا تھا۔ اس نے جس پیچیدگی میں خود کو ملوث کیا تھا اس سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ صرف موت ہی اس کی الجھن کا حل تھی۔ لیکن اس نے زندگی بھر زندگی سے محبت کی تھی۔ وہ موت کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے ابھی چند لمحے پہلے کی صورت حال کا تجزیہ کیا تو حیران رہ گیا۔ اختر ملک کے فائر کرنے کے بعد وہ بھاگا تھا۔ مگر اس کا سبب زندگی سے محبت نہیں۔۔۔ یہ احساس تھا کہ جن لوگوں کو وہ پہلے دکھ دے چکا ہے' اب ایک اور الجھن میں نہیں پھنسانا چاہیے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ وہیں ڈٹ گیا ہوتا۔

اس کے ساتھ ہی اسے سمیرا کا خیال آیا۔ اور سمیرا کا خیال آتے ہی موٹر سائیکل کی رفتار اس نے بلا ارادہ کم کر دی۔ سمیرا نے کہا تھا۔۔۔ کبھی کوئی غیر ضروری خطرہ مول نہ لینا۔ میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتی۔ پھر وہ جھنجلا گیا۔ اب سمیرا کو کبھی اس کی پروا نہیں ہوگی۔ اس کی تکلیف سے کوئی غرض نہیں ہوگی۔ پھر احتیاط کا کیا فائدہ۔ اس نے موٹر سائیکل کی رفتار انتہا تک پہنچا دی۔

اگلے موڑ پر سائن نظر آ رہی تھی۔۔۔ احتیاط سے' موڑ خطرناک ہے۔ پھر دوسری طرف سے آتی کار کی ہیڈ لائٹس نے اس کی آنکھیں چندھیا دیں۔ موٹر سائیکل اس کے قابو سے باہر ہو گئی۔ کیونکہ روشنی سے بچنے کے لیے اس نے ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔ موڑ بہت تیزی سے قریب آ رہا تھا پھر موڑ پیچھے رہ گیا۔ موٹر سائیکل ریلنگ سے ٹکرائی اور اچھل کر سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں جا گری۔

زندگی کی وادی میں موت کا اندھیرا پھیل گیا۔ صرف موٹر سائیکل کا پہیہ متحرک تھا۔ ورنہ ہر طرف سکوت ہی سکوت تھا۔

پانچ چھ سال کا وہ بچہ وسیع و عریض لان میں سائیکل چلا رہا تھا۔ وہ لان کا چکر لگاتا اور پھر سوئمنگ پول کی طرف چلا جاتا۔ وہ سوئمنگ پول کی منڈیر پر چلاتے ہوئے پورا چکر کاٹتا۔ موڑ پر بھی سائیکل کی رفتار کم نہ ہوتی۔ سائیکل چلانا سیکھتے ہوئے وہ اس کا دوسرا ہی دن تھا۔

بوڑھی باوقار عورت بچے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ بچہ اس کے اندر ہمیشہ متضاد جذبات جگاتا تھا۔ اس سے نفرت بھی محسوس ہوتی اور ٹوٹ کر پیار بھی آتا۔ اس وقت بھی وہ ان متضاد جذبات میں گھری ہوئی اسے دیکھے جا رہی تھی۔

بچہ سائیکل چلانے میں اس طرح محو تھا کہ اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہی نہیں تھا۔ مگر سوئمنگ پول کی طرف جاتے ہوئے اسے اپنے وجود میں نگاہوں کی چبھن کا احساس ہوا۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ سفیدے کے درخت کے نیچے اس کی ماں کھڑی اسے گھور رہی تھی۔ وہ شاید ابھی آئی تھی۔ بچہ گڑبڑا گیا۔ سائیکل کے ہینڈل پر اس کا کنٹرول نہیں رہا۔ توازن بگڑا اور وہ سائیکل سمیت نیچے گر گیا۔ تاہم اس کے چوٹ نہیں لگی۔

''مظفر راشد!'' ماں نے اسے پکارا۔

اس نے نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ ''جی ممی؟''

''سائیکل وہیں چھوڑو اور یہاں آؤ'' ماں کا لہجہ سخت تھا۔

بچہ سائیکل وہیں چھوڑ کر ماں کے پاس آ گیا۔ اس کی نگاہوں میں سوال تھا۔ ماں اس سے کبھی سخت لہجے میں بات نہیں کرتی تھی۔

اگلے ہی لمحے اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ ماں نے پوری قوت سے اس کے رخسار پر طمانچہ مارا تھا۔

بچے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''ممی۔۔۔ آپ نے مجھے کیوں مارا؟''

”تم اس طرح سائیکل کیوں چلا رہے تھے۔ سوئمنگ پول میں گر پڑتے تو کیا ہوتا؟“

”لیکن ممی۔۔۔۔ میں گرا تو نہیں۔“

”گرے نہیں مگر گر تو سکتے تھے۔ آئندہ کبھی ایسا نہ کرنا بلاوجہ خود کو خطرے میں ڈالنا بہت بری بات ہوتی ہے۔ اللہ میاں ناراض ہوتے ہیں۔ بولو۔۔۔۔ آئندہ ایسا کرو گے؟“

بچہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ ”نہیں ممی کبھی نہیں۔“

ماں نے اسے سینے سے بھینچا اور اس کے چہرے پر بوسوں کی بارش کر دی۔ اب جاؤ۔ میں نے میز پر تمہارا دودھ کا گلاس رکھ دیا ہے۔ پی لو۔“

بچے کے جانے کے بعد وہ بوڑھی عورت سے مخاطب ہوئی۔

”ممی۔۔۔ آپ اسے منع نہیں کر سکتی تھیں؟“

”تو اس میں برائی کیا تھی۔“ بوڑھی عورت نے بے نیازی سے کہا۔

”اگر وہ سوئمنگ پول میں گر جاتا تو۔۔۔۔؟ اسے تو تیرنا بھی نہیں آتا“

”تو کیا ہوتا۔ مر جاتا۔“

”آپ کو اس کی کوئی پروا نہیں؟“ لڑکی کے لہجے میں حیرت تھی۔

”کیوں ہو۔ وہ میرا کیا لگتا ہے؟“

”نواسا ہے آپ کا۔“

”نہیں۔ وہ میرے بیٹے کے قاتل کا بیٹا ہے۔“

”آپ کب تک اس انداز میں سوچتی رہیں گی۔ وہ آپ کا بیٹا ہے۔ آپ کا مظفر اور میرا راشد۔ میرے راشد نے جاتے جاتے اپنی غلطی کی تلافی کر دی تھی۔“

بوڑھی عورت کچھ دیر سوچتی رہی۔ اس کے چہرے سے اس کی باطنی کشمکش

کا اظہار ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سر اٹھا کر بولی۔

”شاید۔۔۔۔ شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر مجھے اس حقیقت کو قبول کرنے میں نہ جانے کتنا وقت لگے گا۔“ پھر وہ اٹھی اور اندر چلی گئی۔

سمیرا دیر تک وہیں بیٹھی رہی۔ ”میں جانتی تھی ممی کہ میں ماں بننے والی ہوں“۔ اس نے خود کلامی کی۔ ”لیکن اسی لیے میں نے آپ سے اور پاپا سے یہ راز چھپائے رکھا۔ اس وقت تک‘ جب تک سب کچھ خود عیاں نہیں ہو گیا اور اس وقت کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔“

وہ دن‘ وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی جب اسے پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ راشد نے اپنی محبت اور شادی کی نشانی اسے سونپ دی ہے۔ وہ وہی دن تو تھا۔۔۔۔ راشد کی زندگی کا آخری دن‘ جب وہ پہلی اور آخری بار اس گھر میں آیا تھا۔۔۔۔ اور اگلے روز اخبار میں اس کی موت کی خبر چھپی تھی۔۔۔۔